

ISSN 2456-8384

قَالَ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ
سُورَةُ مَائِدَةِ آيَةُ ١٥٦

ستمبر و اکتوبر ۲۰۱۷ء محرم نمبر ۱۳۳۹ھ

ماہنامہ

شعاع کلمہ



نور ہدایت فاؤنڈیشن، حسینہ غفران مااب، چوک، لکھنؤ-۳



ISSN 2456-8384

R.N.I NO.UPBIL/2004/13526

Postal Regd. No. SSP/LW/NP-75/2017-19 Dispatch Date: 2 & 6 of Every Month

Annual Rs. 200/-

संयुक्तांक

Per Copy- Rs.25/-

Joint Issue Price Rs.50/-

शुआ-ए-अमल

हिन्दी, उर्दू मासिक पत्रिका लखनऊ

Joint Issue September - October 2017



ڈاکٹر شام غریباں عمدۃ العلماء آیۃ اللہ سید کلب حسین نقوی اختر

ولادت: ۶ رجب المرجب المعظم ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۸۹۴ء

وفات: ۱۷ جمادی الاول ۱۳۸۳ھ مطابق ۶ اکتوبر ۱۹۶۳ء (یکشنبہ)

SHUA-E-AMAL

Lucknow



NOOR-E-HIDAYAT FOUNDATION

Imambara Ghufraan Maab, Chowk, Lucknow-3 (U.P.) INDIA, Ph.:0522-2252230

ISSN 2456-8384

تبلیغ

Per Copy 40/-
Annual 200/-

نور ہدایت فاؤنڈیشن کا اسلامی، علمی اور تحقیقی

ماہنامہ
شعاع عمل
لکھنؤ
ستمبر و اکتوبر ۲۰۱۹ء

زیر سرپرستی

قائد ملت حجة الاسلام والمسلمین

پروفیسر مولانا سید کلب جواد نقوی صاحب قبلہ (امام جمعہ لکھنؤ)

عزت آف نواب رضا صاحب، بھوپال ✽ عزت آف سید احمد عباس نقوی صاحب، ممبئی

سید مصطفیٰ حسین نقوی 'اسیف جاسی'

قائم مہدی نقوی تہذیب نگردی

آصف عباس نوگانووی

ترسیل زر کا پتہ

نور ہدایت فاؤنڈیشن، امام باڑہ غفران آباد، مولانا کلب حسین روڈ، چوک، لکھنؤ-۳

Phone No: 0522-2252230

Mobaile No: 08736009814 -09335996808

پبلشر- پرنٹر، سید مصطفیٰ حسین نقوی نے مالک ایس۔ کلب جواد نقوی کے لئے نظامی پریس و کٹوریا سٹریٹ، پوزٹ حسین مارکیٹ چوک لکھنؤ (یو۔ پی)
سے چھپوا کر نور ہدایت فاؤنڈیشن، امام باڑہ غفران آباد، مولانا کلب حسین روڈ، چوک لکھنؤ (یو۔ پی) سے شائع کیا۔ ایڈیٹر: سید مصطفیٰ حسین نقوی

محرم نمبر ۱۴۳۹ھ

شمارہ ۴۳

جلد ۱۲

قیام مؤسسہ

۱۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۹ھ / ۱۶ جولائی ۲۰۱۸ء

اجراء جدیدہ

۱۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۹ھ / جولائی ۲۰۱۸ء

نگراں: م۔ ر۔ عابد گولنگ لکھنؤ

مجلس مشاورت

- ✽ پروفیسر علامہ علی محمد نقوی، علی گڑھ
- ✽ ڈاکٹر مہدی خواجہ چیری، ایران
- ✽ مولانا حسن ظفر نقوی، کراچی
- ✽ کیپٹن سکندر رضوی، لکھنؤ
- ✽ پروفیسر سید حسین کمال الدین اکبر، الہ آباد
- ✽ ڈاکٹر ارشد علی جعفری، لکھنؤ
- ✽ شاعر اہل بیت رضا سرسوی
- ✽ سید سیف تقی نقوی، دہلی
- ✽ محمد عالم صاحب، حسین آباد، لکھنؤ

ارشاد

ہمارے نزدیک یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ امام حسینؑ نے اپنی تمام عمر میں جو قدم بھی اٹھایا وہ حدود دین الہی کے اندر اور جو عمل بھی کیا وہ اپنے خالق کے بنائے ہوئے دستور العمل کے مطابق۔ عمل کا مشیت خالق کے مطابق ہونا حسینؑ ہی کا کام تھا اور نتائج کی ذمہ داری کا بار صرف خالق کی قدرت پر تھا مگر عمل کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر نگاہ تلاش کو اپنا مطلوب اس سید و سردار جو انسان جنت کی سوانح عمری میں کچھ ایسے بے نظیر انداز سے مل گیا کہ ہر باخبر انسان حسینؑ کے کردار کو اپنی راہ عمل بنانے کے واسطے خوشی سے تیار ہو گیا۔

عالم انسانیت میں یہ شان صرف حسینؑ ہی کی ہے کہ جتنا جتنا زمانہ گزرتا جاتا ہے اتنا ہی اتنا رنگ شہادت نکھرتا جاتا ہے اور حسینؑ کی قربانی میں تازگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ آج سے چند صدی قبل مسلمانوں کے علاوہ کب کسی غیر نے اس مظلوم کے کارناموں سے سبق لینے کی اپنے پیروؤں کو تعلیم دی تھی مگر اب تیرہ سو سال گزرنے کے بعد رنگ شہادت اتنا روشن ہوا کہ ہر مذہب والا، ہر ملت کا پیروکار، ہر قسم کی سیاست کا شیداء اپنی قوم اور اپنی جماعت کے سامنے حسینؑ کی مثال پیش کرنا اپنی تبلیغ کا جزو اعظم سمجھ رہا ہے۔

اگر مناسبت محل اجازت دیتی تو میں بلا مبالغہ سیکڑوں ایسے لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں کے نام اور ان کے اقوال پیش کر سکتا تھا جو حسینؑ ابن علیؑ کی تقلید، ان کی پیروی اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی دنیا سے فرمائش کر چکے اور فرمائش کر رہے ہیں۔

نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ اتنی گنجائش ہے نیز اس وجہ سے کہ میرا مذکورہ بالا بیان کم از کم ہندوستان میں تو قابل انکار نہیں۔ کیا دنیا میں کوئی اور بھی ہستی ایسی پیش کی جاسکتی ہے جو یوں تمام اقوام عالم اور مذاہب عالم کے واسطے راہبر بن سکی ہو۔

نہیں ہرگز نہیں۔ یہ حسینؑ ہیں صرف حسینؑ جن کے مصائب کی یاد تازہ کرنے کا زمانہ محرم ہے اور اسی ماہ محرم سے سن ہجری کی ابتدا ہے اور مجھ کو یقین ہے کہ دنیا کے انصاف پسند حسینؑ اور ان کے ماننے والوں کو ہرگز نہ بھولیں گے جو سب کے سب مظلوم کے فدائی اور ظالم کے دشمن ہیں۔

(ذاکر شام غریباں عمدۃ العلماء آیۃ اللہ سید کلب حسین نقوی اختر طاب ثراہ)

ارشاد

حسینؑ اس بات کا بیڑا اٹھا کر اٹھے۔ کہ جان جائے مگر امتِ رسولؐ کو عذاب الہی سے نجات دیدوں۔ اسلام کو زندہ کروں۔ اور مسلمانوں کو ہلاکتِ ابدی سے بچاؤں۔

انہوں نے اس مقصد کیلئے دنیا کے عظیم ترین مصائب کو برداشت کر کے کربلا کے دل دوزمرقع کو اپنے اور اپنے اعزا و اقارب کے خون سے ہمیشہ کے لئے رنگین کر دیا۔ اور تاریخِ عالم کے ورق کو اپنی مظلومیت کے تذکرہ سے قیامت تک کو مرفحہ ماتم بنا گئے۔

انہوں نے یہ سب کس کے لئے کیا، ہمارے لئے، لیکن کن معنی سے؟ اس معنی سے کہ وہ اپنی اس عظیم قربانی کے ذریعہ سے شریعتِ اسلامیہ کا احیاء کر رہے تھے اور احکامِ شریعت کی تجدیدِ ظلم و استبداد کی طاقتوں کو جو اسلام کی مٹانے والی تھی۔ فنا کر رہے تھے۔ اور احساساتِ اسلامی کو بیدار، اور اس طرح وہ ہمیشہ کیلئے ایک قوم کی تشکیل کر رہے تھے۔ یعنی حیاتِ ثانیہ دے رہے تھے۔ کہ جو نجات کی مستحق اور جنت میں جانے کے لائق ہو۔ اور شریعتِ اسلامیہ کی پابندی اور احکامِ مذہبی کی نگہداشت کا باعث، حقیقی طور پر امتِ مرحومہ کہنے کے قابل ہو۔

اسی اعتبار سے حسینؑ نجات دہندہ امت تھے۔ اور اسی معنی سے یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ ہمارے لئے شہید ہوئے۔ انکا مقصد یہ تھا کہ افرادِ اسلام سچے معنی میں مسلمان اور تعلیماتِ اسلام کا مکمل آئینہ اور پابندیِ احکامِ شریعت اور اطاعتِ الہی کا نمونہ بن جائیں۔ ان کے نجات دہندہ ہونے کا کوئی ایسا مفہوم قرار دینا درست نہیں جو ان کے مقصد کو پامال کر دے اور افرادِ ملت میں پابندیِ احکامِ شریعت کے جذبہ کو فنا کی حد تک پہنچائے۔

(آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی عالمِ طبِ شراہ)

فہرست مضامین

(ستمبر و اکتوبر ۲۰۱۷ء / ذی الحجہ و محرم الحرام ۱۴۳۹ھ)

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	(اداریہ)	م۔ر۔عابد	۵
۲	کیسا ماتم؟ کون سا تم؟ کیا ہوا؟	خطیب اعظم علامہ سید سبط حسن نقوی فاطر جاسی	۶
۳	حسینی تعلیم و تربیت کے خصوصیات	حکیم الامت علامہ ہندی آیت اللہ سید احمد نقویؒ	۸
۴	سجدہ عبادت اور سجدہ تعظیمی	عمدۃ العلماء آیت اللہ سید کلب حسین نقوی اخترؒ	۹
۴	شہدائے کربلا (قسط - ۳)	آیت اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقویؒ	۱۷
۵	سید الشہداء حضرت امام حسینؑ	زبدۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ	۴۲
۶	قربانی کی اہمیت	صفوۃ العلماء مولانا کلب عابد نقوی رحمت مآب	۴۴
۷	روز عاشورہ کے مناظر کی کیفیت	فخر وطن سید کلب مصطفیٰ نقوی ایڈوکیٹ	۴۵
۸	عشرہ محرم اور ملی تنظیم	فخر قوم مولوی سید کلب عباس نقوی ایڈوکیٹ	۴۸
۹	صحیفہ کربلا کا ایک ورق	حسینی شاعر سید ظفر عباس نقوی فضل اجتہادی	۵۱
۱۰	حسینیت زندہ باد	پروفیسر علامہ علی محمد نقوی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۵۳
۱۱	شام غریباں کی یاد میں	مفکر اسلام ڈاکٹر مولانا کلب صادق نقوی	۵۷
۱۲	استقلال	نجم العلماء مولانا سید علی نقوی	۵۸
۱۳	واقعہ کربلا تاریخ انسانی کا سب سے بڑا واقعہ	علامہ سید مجتبیٰ حسن کامونپوری صاحب قبلہ	۶۲
۱۴	سلام	قائم مہدی نقوی تدہیب نگروری	۶۸
۱۵	مقتل حسینؑ شجاع شہر شرقی، بحالی سید سجادؑ	مفکر و حیدر خواجہ محمد لطیف انصاری	۶۹
۱۶	قطعہ	حسینی شاعر ظفر عباس نقوی فضل اجتہادی	۷۶
۱۷	مرثیہ: در حال حضرت قائمؑ (بند ۲۱۰)	دعبل ہند مولانا فرزند حسین نقوی ذاکر اجتہادی	۷۷
۱۸	قطععات	حضرت جوہر بہراچی و حضرت مہدی نقویؒ	۱۰۳
۱۹	مسدس در حال حضرت سید سجاد علیہ السلام	عالیجناب سید مختیار حسین جوہر بہراچی	۱۰۴
۲۰	خبرنامہ	(ادارہ)	۱۰۵

مجلس ادارت

- ڈاکٹر امانت حسین نقوی
- حیدر عباس نقوی، الہ آباد
- عمیل شمسی، لکھنؤ
- واصف احمد نقوی، سمیر
- مہدی رضا
- شاہد علی اعظمی
- ذوالفقار حیدر اعظمی
- الحاج مرزا ہمایوں قدر
- ڈاکٹر عارف عباس
- ریحان عالم، لکھنؤ
- سلمان حسین، لکھنؤ
- بنت زہراء ندی الہندی
- الحاج فرید مہدی رضوی

- ظفر حسین رضوی، بیورو چیف ممبئی
- عرفان حیدر، بیورو چیف مدھیہ پردیش
- کیف نقوی، بیورو چیف دہلی

R.N.I. NO.
UPBIL/2004/13526
Postel Regd. NO.
SSP/LW/NP-75/2017-2019

WEBSITE:

www.noorehidayatfoundation.org
www.naqeeblucknow.com

E_mail:

noorehidayat@yahoo.com
noorehidayat@gmail.com

زرسالانہ

ایک سال کے لئے: -/200
پانچ سال کے لئے: -/800
لائف ممبر شپ: -/5000

ماہنامہ ”شعاع عمل“، لکھنؤ

ستمبر و اکتوبر ۲۰۱۷ء

واقعہ کربلا کی یاد

کربلا وہ اکلوتا واقعہ ہے جس کی یاد عہد بہ عہد، صدی بصدی، سال بسال، دن بہ دن، صبح و شام منائی جاتی ہے۔ یہی نہیں، یہ یاد زمان و مکان کی ظاہری و باطنی محدودیت سے بھی آزاد ہے۔ اس کے مقابلہ پر تاریخ آدم و عالم کا کوئی واقعہ نہیں آسکتا ہے۔ آخر اس سب کا راز کیا ہے؟ اس کا مجملہ جواب اپنی نظر میں معرکہ کربلا (انقلاب حسینی) کی عصری توانائی ہے۔ (یہاں 'عصری' کی معنویت کسی ایک عصر تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہر عصر پر محیط ہے۔) اس توانائی کے دو پہلو کہے جاسکتے ہیں، جو بنیادی طور سے ایک ہی ہے۔ یعنی اسلامی لحاظ سے اور انسانیت کے اعتبار سے ویسے اسلام اور انسانیت میں حد فاصل قائم نہیں کی جاسکتی، کم از کم کربلا کی حد تک۔ پھر بھی اگر کسی صاحب رائے کو کسی ایک نام سے رزرویشن ہے، تو دو نام لینے میں کیا جاتا ہے، دو پہلو کہنے میں کیا حرج!!

اپنی نظر اس راز تک کیسے پہنچی، یہ بھی بتاتے چلیں، اپنے اہل نظر قارئین کرام سے کیا پردہ ہے۔ یوں بھی یہ کوتاہ نظر مفلس علم و آگہی اس معاملہ میں اپنی نظر کے لئے دانشورانہ ملکیت کے حق (Intellectual Property Right) کا مدعی بھی نہیں ہے۔ خیر اپنی نظر اس راز تک پہنچی تو قرآن کریم کے سورہ 'عصر' کے سہارے۔ مفسرین ذوی الاحترام کی رائے ہمیں نہیں معلوم (امید ہے جاہل مسئلہ سمجھ کر مفتیان کرام ہمیں تفسیر بالرائے میں مانو ذہن فرمائیں گے۔) ہمیں تو لگتا ہے، کربلا اس سورہ کی بھرپور عملی تفسیر ہے۔ (یہاں 'تفسیر' کہنے پر اعتراض ہو تو 'مظہر' کہہ لیا جائے۔)

کربلا میں جدھر دیکھئے، انسانی شکل کا بھیڑ یا دھنسان دکھائی دیا۔ اس کے ہر فرد نے جان داؤں پر نہیں لگائی بلکہ اگر کسی کے پاس متاع ایمان سے کچھ تھا بھی تو اسے لٹا دیا اور ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ وہ جو سہاؤ نے وعدے تھے وہ لبھاؤ نے جھانسنے سے زیادہ ثابت نہ ہوئے۔ کربلا کے بعد جو منظر نامہ مرتب ہوا اس میں ان میں کسی کو بھی اپنی دودن کی زندگی میں دنیا میں سر اٹھا کے چلنا نصیب نہ ہوا۔ "لفی خسر" کے یہی معنی ہیں۔ اس بھیڑ بھاڑ میں 'الا' کے حصار میں ایک جماعت بھی دکھائی دی جو ایمان و عمل صالح کی مثال بنی ہوئی حق و صبر کی وصیت کو عملی جامہ پہناتی ہوئی ملتی ہے۔ انہوں نے بھی بظاہر جان گنوائی مگر حیات جاوداں مول لے لی۔ اس حیات کا شعور نہ رکھنے والی دنیا میں بھی ان کا نام سرخروی کی علامت بن گیا۔ ان کی سرخروی کی معراج وقت عصر سے شروع ہوئی اور ہر عصر (زمانہ) پر چھا گئی۔ زمانہ ان کے ایمان و عمل صالح و وصیت حق و صبر، کی مثال لانا سکا۔

ان کے لازوال کارنامے کی مثال ہر عصر کو تحریک و توانائی دیتی رہی۔ آج کے عصری حالات بھی اسی انداز کے ہو چکے ہیں، اس کے حل کے لئے ہماری نظر کربلا کی ہی طرف اٹھتی ہے۔ اس کی عصری توانائی عصر حاضر کی بھی مشکل آسان کر سکتی ہے۔

ہماری عصری جبین نیاز ان کے آگے خم ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں، آج ایک یزید نہیں ہے، بے شمار یزید ہیں جو دنیا کے جسموں پر ہی نہیں روح و جان (نفسیات) پر حاکم ہو چلے ہیں، لیکن ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، ایک 'حسینیت' سارے یزیدوں کا قصہ تمام کرنے کو کافی ہے۔ خدا ہمیں حسینیت سے وابستگی کی توفیق عنایت فرمائے۔

شعاع عمل کا تازہ شمارہ کربلا کو عصری ابلاغی خراج عقیدت کے طور پر ناظرین کرام کی نذر ہے۔ آگے اس کے نثری و منظوم نگارشات آپ سے ہم کلام ہیں۔

م۔ر۔عابد

کیسا ماتم؟ کون سا غم؟ کیا ہوا؟

کلم اہلبیت ملک الناطقین خطیب اعظم علامہ سید سبط حسن نقوی فاطر جاسی

ذره اور آسمان کا ہر ستارہ اس شخص کو جانتا ہے جس کا ماتم ہے۔ دوستوں کا کیا ذکر دشمنوں کو بھی معلوم ہے۔ ہم اتنا بتائے دیتے ہیں کہ اگر اس کی قدر معلوم کرنا چاہتے ہو کہ اسلام میں اس کی وجاہت کیا تھی تو عموم غم و ماتم کو دیکھو جس میں تمہیں علماء سربرہنہ نظر آئیں گے۔ فقہاء اس غم کے عبادت ہونے کا فتویٰ دیتے دکھائی دیں گے۔ صلحاء و اتقیا اس غم سے احتراز کو خلاف صلاح اور خلاف تقویٰ سمجھتے ہوئے ملیں گے۔ عامہ مومنین اس کو ایک دینی آبائی رسم تصور کرتے ہوں گے۔ اگر اس کی مظلومی کی جانچ منظور ہو تو غیر فرقوں کا متاثر ہونا دیکھو جن کو دین سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر محبوبیت رسول کا امتحان مقصود ہو تو ام سلمہؓ کا خواب سنو جس میں پیغمبرؐ منہ پر خاک ملے ہوئے نظر آیا۔ در آنحالیکہ وہ برہنہ سر بھی تھا۔

اگر اس مویذ من اللہ ہونے کی داستان طویل سننا چاہتے ہو تو اس کی عزاء کے بقا کا لحاظ کرو جس کے روکنے کے لئے ہر سال بہت سے گروہ کمر ہمت مضبوط باندھتے ہیں مگر تمام جدوجہد کے بعد اور کمال سعی و کوشش کے بعد صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کو تنکے نے ٹکردی۔ جب وہ ذات جلیل القدر موجود تھی تو دنیا اس کے سامنے دشمن بن کر آئی اور اب جب وہ زیر خاک شفا، عاشور ساخت مرحلہ جھیلے ہوئے آرام میں ہے، جب بھی دنیا اس کی عداوت سے غافل نہیں۔

اگر وہ نہیں تو اس کا ماتم ہی سہی۔ بہر حال حملہ ضروری ہے۔ چاہے وہ کامیاب ہو یا نا کامیاب۔ روکنے والوں کو سنبھلنا چاہئے۔ ان آنسوؤں نے اپنی

مجھے نہیں معلوم کہ کوئی دنیا میں ایسا بھی ہے جس کو یہ موسم معلوم نہ ہو، عشرت پسند دل جو واعظوں کی آواز پر کان نہیں لگاتا، اور اپنی ہوا و ہوس پر جان دیتے ہوئے زندگی کی منزلیں طے کر رہا ہے محرم کا چاند دیکھتے ہی توبہ کر کے بیٹھ گیا۔ اب وہ زاویہ نشین زاہد ہے جسے دنیا اور اس کی آروزیں دعوت پر دعوت دے رہی ہیں لیکن وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اگر اس سے پوچھیں کس منزل پر ٹھوکر کھائی؟ کہاں مصیبت گزری تو وہ ڈبڈبائی آنکھ آئینہ پیش کر کے خاموش ہو جائے گا۔

مکانات جن میں اس مہینہ سے پہلے رونے کی آواز کا نام لیا جاتا تو ان کے رہنے والے کے چشم و ابرو پر بل پڑ جاتے۔

لیکن آج ان مکانوں میں ہنسی کی آواز اتنی ہی بری معلوم ہوتی ہے جیسی اس زمانے کے قبل رونے کی آواز ناگوار۔ دیندار اہل ثروت مسندیں اٹھے ہوئے بزم ماتم کے سجنے پر آمادہ ہیں۔ فقراء اپنے جھونپڑوں میں ایک ایک چراغ جلانے ہوئے بھرے دلوں کو خالی کر رہے ہیں۔ زبانوں کو مشغلہ ذکر مول لے چکا ہے، وہ اپنی خدمتوں میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ہاتھ ماتم میں وقف ہیں۔ ان اعضاء سے دل نے کچھ کہہ دیا ہے وہ نہ معلوم کہاں کیا کہا کہ سامان غم کی فراہمی میں اتنا ہی غرق ہیں جس قدر امکانی اسباب سرور کے مہیا کرنے میں مشغول ہو سکتے ہیں۔

ہم نے یہ سب سنا مگر کس کا غم ہے۔ یہ نہ معلوم ہوا ہمیں امید نہ تھی کہ کوئی یہ سوال کر سکے گا کیونکہ دنیا کا ہر

کمزور روانی سے زوردار سلطنتیں بہادریں اور جباروں کے تخت چھین لئے۔

توبۃ الہی کی لواٹھ رہی ہے جو بصیرت دل سے مخفی نہیں ہو سکتا۔

بہ نور باریِ اعضاء شناختم اورا

این است حسینؑ کز خدا ساز نمود

اسلام چو ختم شد بحب دنیا

(ماخوذ از خطیب آل محمد، منشورہ امامیہ مشن، لکھنؤ، ص ۴۳ تا ۴۷)

(بقیہ صفحہ نمبر ۸ کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

دین است حسینؑ دیں پناہ است حسینؑ
اہل دنیا نے صرف شہادت حسینؑ سے حقیقت اسلام کو پہچانا۔
ورنہ نام کے مسلمانوں نے کب کا اسلام مسخ کر دیا تھا۔

(ماخوذ از ماہنامہ رضا کار لاہور محرم نمبر جنوری ۱۹۴۴ء صفحہ ۳۴ تا ۳۵)

جس نے پیغمبر کو پہچان لیا ہے وہ اسے بھی پہچانتا ہے۔

بلکہ یوں کہوں گا کہ جو خدا سے واقف ہے وہ اس سے ناواقف

نہیں۔ اس کا لہو کس کی راہ میں سبیل ہو گیا؟ قتل ہونے سے اس

کی غرض کیا تھی؟ دولت کے طالب دولت اس لئے طلب

کرتے ہیں کہ وہ زندہ رہ کر اسی سے فائدہ اٹھائیں۔ لیکن

مرنے والے پر طلب دنیا کا دھبہ نہیں لگایا جاسکتا۔ یا اس لئے

دنیا طلب کی جاتی ہے کہ میرے بعد میری اولاد اچھی طرح بسر

کر سکے گی۔ ہاں یہ سچ ہے لیکن اس شخص کے متعلق یہ احتمال

نہیں ہو سکتا۔ جو شیر خوار اور نوجوان سے اپنی زندگی میں دست

بردار ہو چکا ہو۔ اچھا یہ بھی ممکن ہے کہ قرابت داروں کے کام

آنے کے لئے سعی کی جائے لیکن یہاں یہ تو ہم بھی نہیں ہو سکتا۔

ورنہ مدینہ برباد نہ ہوتا اور کربلا آباد نہ ہوتی۔ خاصانِ خدا کے

جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب انہیں اس ہمت

بلند کا تصور ہوتا ہے جس کے سامنے گردن کی رگوں کا کٹنا

آسان معلوم ہوتا تھا اور تعلقات باری کا قطع ہونا مشکل بلکہ

محال نظر آتا تھا۔ یہ جو کچھ ہوا دین و شرع کے لئے ہوا۔ خدا

رسولؐ کے لئے ہوا۔ ایمان والوں کے سر پر قیامت تک کے

لئے وہ احسان چھوڑا جو آج سے لیکر نفخ صورت تک ادا نہیں

ہوسکتا۔ اہل عقل آثار و علامات سے حقائق کا پتہ لگا لیتے ہیں

۔ کیا ان صفات سے بھی شناخت ناممکن ہے؟ بیشک دستور ہے

کہ سر ہی سے انسان کی شناخت ہوتی ہے لیکن ہم وہ نہیں ہیں

کہ اپنے لے سر سردار کو نہ پہچانیں۔ اس کے ہر جزو بدن سے

حسینی تعلیم و تربیت کے خصوصیات

حکیم الامت علامہ ہندی آیت اللہ سید احمد نقویؒ!

کئے۔ ممبروں پر مسجدوں میں ساہا سال گالیاں تک دیں۔ جمل
وصفین کی لڑائیوں میں علیؑ و آل علیؑ کا خاتمہ کر دینے کی ٹھانی۔
کامیابی نہ ہونا امر آخر ہے۔ مختصر یہ ہے کہ امام حسینؑ کی پرورش و
 تربیت انہیں ہاتھوں سے ہوئی تھی۔ وہ عربی ماحول سے علیحدہ
 رکھے جاتے تھے۔ وہ ملک و جغرافیائی حدود و آب و ہوا، گرد و پیش
کی چیزوں کے اثر سے علیحدہ رکھے جا رہے تھے۔ ان پر آباء و
اجداد یعنی گذشتہ سلسلہ خاندان کے اثر اور ماں باپ کے اثر سے
عرب کے عالم اخلاقی خصوصیات سے بالکل جدا تھے۔ بنا بر تحقیق
یہ مسیو لیبان اصلی مکون نظام اخلاق کے آباء و اجداد ہیں۔ قرآن
مجید نے بھی بار بار اس مکون اخلاق کا تذکرہ کیا ہے۔ قَالُوا أَقْدَوْ
جَدْنَا أَبَائَنَا كَذَّالِكِ يَفْعَلُونَ۔ وہ لوگ کہتے ہیں ہم نے
اپنے آباء و اجداد کو ایسا ہی کرتے پایا۔ قَالُوا أَحْسَبْنَاهُ مَا وَجَدَ
نَا عَلَيْهِ أَبَائُنَا۔ وہ لوگ کہتے ہیں۔ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو
جس روش پر پایا۔ وہ ہمارے واسطے کافی ہے۔ قَالُوا بَلْ
نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ أَبَائُنَا۔ وہ کہتے ہیں ہم نے اپنے آباء
اجداد کو جس روش پر پایا ہم اُسی کی تقلید کرتے ہیں۔ بیشک یزید
وہی کر رہا تھا اور وہی کہہ رہا تھا جو اس کے بزرگ کہہ رہے تھے یا
کر رہے تھے۔ چنانچہ سر حسینؑ طشت میں سامنے رکھے ہوئے
بھرے دربار میں اشعار میں یہی تو کہہ رہا تھا کہ کاش آج میرے
بزرگ جو جنگ بدر وغیرہ میں قتل ہوئے موجود ہوتے تو خوش ہو کر
داد دیتے کہ میں نے ان کا کیسا انتقام لیا۔ سادات بنی ہاشم کو قتل کر
کے بیشک میں عتبہ کی نسل میں شمار نہ ہوتا۔ جو آل بنی احمد سے جو وہ
کر گئے بدلہ نہ لیتا۔ درحقیقت بنی ہاشم نے ملک گیری کے

(بقیہ صفحہ نمبر ۷ پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

دین اسلام درحقیقت اخلاق سے جدا نہیں ہے۔ وہ تو عین اخلاق ہے اس کے جملہ اوامر و نواہی، احکام اخلاق ہی ہیں۔ اس کا بانی پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ اِنِّیْ بُعِثْتُ لِاٰتِمِّمَ مَّكَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔ میری بعثت محض انسان کے سدھار اور مکارم اخلاق کی تکمیل کی غرض سے ہے۔ وہ لوگ جو مذہب کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ اور اخلاق اخلاق پکارتے ہیں۔ اُن کو اخلاقی نقطہ نظر سے دین اسلام کو جانچ کر اسلامی اخلاق پرستی کرنا چاہیے۔ ہم حسیّی اخلاق کو اسلام کی صداقت کا معیار بنا کر پیش کرتے ہیں۔ امام حسینؑ نے بھی کربلا میں اپنی اخلاقی حیثیت کو بطور معیار پیش فرمایا تھا۔ امام حسینؑ کی شہادت الہ سے شروع نہیں ہوتی ہے بلکہ یوم ولادت سے شروع ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جس بچہ کی تربیت و اُٹھان اُن باتوں میں ہوئی جن کا نظریہ عربی بگڑی ہوئی عبرانی زندگی سے تصادم کا ہو۔ اور مضر عمران خصال کو سدھارنا اپنا فرض انسانی دے رکھا ہو اور اس اصلاح میں ہر مصیبت و تکلیف کے خیر مقدم کے واسطے تیار ہو اور عملاً ان تکالیف و مصائب کے نمونے تاریخ میں چھوڑ جائے یعنی رسول و علیؑ و بتول سلام اللہ علیہم اُس بچہ کو سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا اُسی وقت سے ایسے بچہ کی اپنی عمرانی زندگی میں کس قدر دشمن ہوگی۔ اور ایسے وجود کو پہلے ہی مٹانے کی فکر میں سرگرداں ہوگی۔ ہر چند کہ اس کا موقع ہاتھ نہ آوے۔ فرعون کو اس خطرہ نے اس امر پر آمادہ کر دیا تھا کہ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کرادے۔ اس کے اختیار و بس کی بات تھی۔ وقت گذرا۔ دشمنانِ رسول و علیؑ و بتول گو اس قدر موقع نہ ملا۔ لیکن جتنا موقع ملا۔ اس سے باز نہ آئے۔ علیؑ و آل علیؑ کی منزلت مٹانے کے لئے طرح طرح سے منصوبے

سجدہ عبادت اور سجدہ تعظیمی

حضرت علی اکبرؑ کی رخصت و شہادت

اقتباس از تقریر: ذاکر شام غریباں عمدة العلماء آیت اللہ سید کلب حسین نقوی اختر

اور زمین پر بسنے والے کل کے کل سجدہ کرتے ہیں تو اسی ایک خالق کو جو حق ہے اور جس کا اسم ذات اللہ ہے۔ یعنی کافرو مومن، مشرک و منافق کی کوئی تخصیص نہیں۔ عام اس سے کہ کوئی ہو۔ کسی مذہب کا پیرو ہو، کسی راہ کا چلنے والا ہو مگر خوشی سے یا بہ جبر کسی نہ کسی صورت سے خدا ہی کو سجدہ کرتا ہے۔ یہ اتنا گہرا راز ہے کہ جہاں تک ہر انسان کی نظر نہیں جاسکتی۔ مشرک بتوں کو سجدہ کریں اور ہم کہیں خدا کو سجدہ کیا یہ ہماری عقل سے بلند ہے مگر فطرت انسانی کا دیکھنے والا، مزاج انسانی کو لباس وجود پہنانے والا کامل استغنا کے ساتھ ارشاد کرتا ہے کہ سجدہ تم خدا ہی کو کرتے ہو چاہے خوشی سے ہو اور چاہے جبر سے۔ ہاں فرق یہ ہے کہ جو خوشی سے سجدہ کرتے ہیں ان کو خدا کبھی نہ کبھی سر بلند بھی کرے گا۔ مگر جو بہ جبر سجدہ کرتے ہیں وہ اس کے نزدیک ذلیل و خوار ہی رہیں گے۔ قرآن کا یہ ارشاد بالکل ایسا ہی ہے جیسے آیت کا بیان ”يَسْبُحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ“۔ خدا ہی کی تسبیح کرتی ہے ہر وہ چیز جو زمین میں ہے یا آسمان میں۔ مَن اور مولا کا فرق جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ آیت پہلی آیت سے بہت زائد عام ہے۔ سجدہ کے بیان میں مَن ہے اور مَن عرف میں ان اشیاء کے لیے آتا ہے جو صاحب عقل و فہم ہوں اور تسبیح کے بیان میں مَن ہے اور مَن جاندار و بے جان سب کے لیے کہا جاتا ہے تو معنی یہ ہوئے کہ تمام عالم میں کوئی چیز ایسی نہیں جو خدا کی تسبیح نہ کرتی ہو حالانکہ ہم نے نہ سنی کسی بے جان کی تسبیح۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ یہاں تسبیح تہری

خاص انداز خالقیت و عظمت و جلالت کے ساتھ مالکِ ارض و سماء، مالکِ آب و ہوا، عالمِ باطن و ظاہر قرآن میں ارشاد کرتا ہے کہ ہر وہ شخص جو زمین میں ہے یا آسمان میں ہے سجدہ کرتا ہے محض اللہ کے لئے چاہے خوشی سے سجدہ کرے اور چاہے مجبور یوں سے سجدہ کرے۔ اور انہیں پر کیا موقوف ان کے سائے اور پر چھائیاں تک ہر صبح و شام اسی کو سجدہ کرتی ہیں۔ یہ وہ کلام ہے جس کی لفظیں اپنے حقیقت کے لحاظ سے یہ بتا دینے کو تیار ہیں کہ یہ انسان کا کلام نہیں، خالق انسان کا کلام ہے۔ بندے کا نہیں، معبود کا بیان ہے۔ دل کے بھیدوں سے جاہل نہیں، وہ کہہ رہا ہے جو قلب کی گہرائیوں سے واقف ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہر وہ مخلوق جو لباس ملکی پہن کر بزم وجود میں قدسی صفات لے کر آیا سر بسجود ہے۔ صرف ایک اسی اللہ کی بارگاہ میں جس کے علاوہ کوئی الہ برحق نہیں۔ اسی طرح انسانوں میں بھی جو لوگ معرفت کی بلندیوں پر پہنچے وہ بھی اپنے رب ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔ مگر ہماری نگاہیں تو ہر وقت دیکھتی ہیں اور بکثرت دیکھتی ہیں کہ انسانوں میں ایسے بھی ہیں جو کبھی بھول کر بھی خدا کو سجدہ نہیں کرتے۔ بتوں کو سجدے ہر روز کرتے ہیں۔ آفتاب و ماہتاب کے سامنے روز دستِ ادب باندھے سر بسجود ہیں۔ آگ کی پرستش دن رات ہے۔ جانوروں کے سامنے عجز و انکسار ہے۔ مگر نہیں جھکتے تو رب حقیقی کے سامنے اور تمام عمر میں ایک سجدہ بھی نہیں کیا تو صرف الہ برحق کو۔ مگر خدا کا ارشاد ہے کہ، ”آسمان والے سب کے سب

مراد ہے۔ یعنی زبان نہ ہو مگر حالت بتاتی ہے کہ خدا کے موجود ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔ اپنی مخلوقیت سے اس کی خالقیت کا اشارہ کر رہے ہیں۔

اپنی احتیاج سے اس کے غنی ہونے کا پتہ دے رہے ہیں اپنے حدوث سے اس کے قدم کی تصدیق کر رہے ہیں۔ اپنے استحکام سے اس کے حکیم ہونے کا اقرار کر رہے ہیں۔ یوں ہی جو خوشی سے سجدہ نہیں کرتے وہ اسکے احکام کی، اس کے تضاد قدر کی اطاعت کر کے سرِ افتیاد جھکا کے سجدہ کر رہے ہیں۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سجدہ کے ایک معنی ہیں۔ سرِ اطاعت جھکا دینا بعض لوگ اپنی تنگ نگاہی سے صرف پہلے ہی معنوں کی طرف مڑے اور کہہ دیا کہ اگرچہ لفظ عام ہے مگر یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر انسان خدا کو سجدہ کرتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ صرف اسلام کے بندے خدا کو سجدہ کرتے ہیں۔ مگر یہ تنگ نگاہی مفہوم حقیقی سے کہیں دور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سجدہ سے مراد سرِ اطاعت جھکا دینا ہے اور جب یہ مراد ہے تو ماننا پڑے گا کہ آیت میں ہر مومن و کافر داخل ہے۔ کیوں کہ دنیا کی کوئی مخلوق ایسی نہیں جو اسکے ارادوں کو روک سکے۔ اس کی مشیت کے سامنے سرتابی کر سکے۔ خدا سے تو انکار لاکھوں نے کر دیا اور کبر و غرور سے بھرا ہوا سر اس کی بارگاہ میں کبھی نہ جھکا یا لیکن اس کا جو حکم آیا اس کے سامنے سرِ اطاعت جھکانا ہی پڑا۔ اگر اس نے پیدا کر دیا تو دنیا میں آنا ہی پڑا۔ اگر دولت دے دی تو خزینہ دار دولت بننا ہی پڑا۔ اگر چادر فقر اڑھائی اس نے تو کسی نہ کسی صورت سے اوڑھنا ہی پڑی۔ اگر مرض دے دیا تو بسترِ علالت آباد ہی کیا۔ اگر اپنی رحمت سے اس نے صحت دے دی تو پھر کار و بار دنیا کرنا ہی پڑا۔ اگر آغوشِ تربیت میں اولاد دے دی تو پرورش کی زحماتیں اٹھانا ہی پڑیں۔ اور اگر یہ نعمت چھین لی تو طوعاً و کرہاً سپردِ زمین کرنا ہی پڑا ہے کوئی کافر ہے جو خدا کے ارادے سے سرتابی کر سکا یا انکار کر

سکا؟ جی نہیں کسی ایک کی یہ طاقت نہ ہوئی۔ جھکا یا سر اس کے احکام کے سامنے اور سب نے جھکا یا اور حقیقی سجدہ یہی ہے۔ یاد رکھیں آپ کہ اصل جو کچھ ہے وہ باطن ہے۔ دل ہے۔ نیت ہے۔ اگر باطن نہ ہو تو ظاہر بے اصل ہے۔ اگر دل میں نہیں تو زبان بے حقیقت ہے اگر نیت نہیں تو تمام عبادت بالکل بے کار۔ نماز پڑھے مگر دل میں ایمان نہیں تو قبول نہیں۔ باطن میں نماز کی وقعت نہیں تو کوئی ثواب نہیں۔

حد یہ ہے کہ وہ ایمان ایمان نہیں جو زبان پر ہو اور دل میں نہ ہو۔ تو معلوم ہوا کہ اصل جو کچھ ہے وہ باطن ہے۔ مگر شریعت نے اعتبار کیا ہے ظاہر کا اور اتنا زبردست اعتبار کہ جب تک باطن میں ظاہر شریک نہ ہو عبادت قبول ہی نہیں۔ مثلاً نماز ہو جو بہترین عمل ہے قبول ہو ہی نہیں سکتی جب تک قیام نہ ہو۔ قعود نہ ہو، رکوع نہ ہو، سجود نہ ہو۔ اور وہ صرف اس لیے کہ ظاہر، باطن کی دلیل ہے۔ قیام کی حقیقت کیا ہے؟ خدا کی فرماں برداری میں جم جانا مگر جس وقت تک انسان نماز میں سیدھا کھڑا نہ ہو قیام کا ظہور نہیں ہوتا۔

رکوع کیا ہے؟ اس کی راہ میں گردن خم کر دینا مگر اس باطن کا ظاہر ہے وہ فعل جس میں گھٹنوں تک ہاتھ پہنچ جائیں۔ یوں ہی سجدہ کیا ہے؟ اس کے ہر حکم کے سامنے سرِ اطاعت جھکا دینا۔ مگر اس باطن کی تصویر ہے پیشانی خاک پر رکھنا تو یہ کیوں فرمائیے کہ آیت میں ظاہر ہی سجدہ مراد ہے جس میں سر زمین تک پہنچ جائے یہ کیوں نہ کہئے کہ یہاں وہی حقیقی سجدہ مراد ہے جس میں سرِ اطاعت جھکے۔ اور جب یہ معنی مراد لیجئے تو تخصیص کرنے کی ضرورت نہیں۔ مومن و کافر، جن و انس خالق کے اشاروں کے سامنے اس کے پرزور ارادوں کے سامنے جبر سے ہو یا خوشی سے سرِ اطاعت جھکائے نظر آتے ہی ہیں۔

یہی وہ چیز ہے جس نے ثابت کر دیا کہ کلام اس کا ہے جو ظاہر کو نہیں دیکھتا بلکہ باطن پر نظر کر کے ارشاد فرماتا ہے کہ جن و

انس و ملک سجدہ کرتے ہیں تو خالق ہی کو جس کے ارادے پلٹائے سے نہیں پلٹ سکتے۔ اچی ہم اور آپ کیا ہیں۔ بڑے سے بڑے کافر و مشرک اس کے احکام کے سامنے سرِ نیاز خم کرتے ہی رہتے ہیں۔ نمبرود نے سر بہت اٹھایا۔ اپنی قوت کے سامنے خلیل خدا کی وقعت نہ سمجھا۔ دولت و سلطنت کو ناکافی سمجھ کر منزل الوہیت کا مدعی ہوا۔ مگر مرض آیا تو سر جھکانا ہی پڑا۔ اور جب ملک الموت کی صورت دیکھ لی تو روح نذر کرنا ہی پڑی۔ اور آج جہنم کے سخت ترین عذاب میں ہے جس سے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ فرعون نے غرور کی انتہا کر دی۔ اپنی سلطنت بچانے کو ہزاروں بچے قتل کر ڈالے مگر جب اس کی مشیت جاری ہوئی تو خود موسیٰ کو گود میں پرورش کیا۔ اپنے مٹانے والے کو اپنے محل میں رکھ کر پروان چڑھایا۔ اور جب عذاب کا دریا اہل کر آیا تو موجوں کے سامنے سر خم ہی کیا۔ یوں ہی ہر ظالم، ہر غاصب ہر سرکش زبان سے انکار کرتا ہی رہا۔ مگر خالق کے ارادوں کے سامنے کسی ایک کا زور نہ چلا اور سب سرِ اطاعت جھکے رہے۔ اس لیے ارشاد ہے کہ جبر سے ہو یا خوشی سے مگر مجھ کو سجدہ کرنا ہی پڑے گا۔ جب یہ واقعہ ہے کہ کوئی انسان اسکو سجدہ کرنے سے بچ ہی نہیں سکتا تو نا فہمی ہے کہ ہم خوشی سے سجدہ نہ کریں بہ جبر سجدہ کریں۔ جس کا کوئی اجر نہیں۔ کوئی ثواب نہیں۔ پھر کیوں نہ خوشی سے سر جھکائیں کہ سر بلند رہیں۔ اس مقام پر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ سجدہ اور وہ سجدہ جس کے واسطے خدا کا ارشاد ہے کہ، ”تمام جن و انس، مومن و کافر خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور ہر وقت ان کی پیشانیاں اسی کی راہ میں جھکی رہتی ہیں۔“

آیا غیر خالق کے لیے بھی صحیح ہے یا نہیں؟ اگر ہم خدا کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کریں تو درست ہے یا نہیں؟ یہ بحث بڑی مشکل ہے اور یقین حکم دشوار ہے۔ تقسیم کی ہے علماء نے سجدوں کی دو قسموں میں۔ ایک سجدہ عبادت اور دوسرے سجدہ

تعظیمی۔ ان کی صورت میں تو کوئی فرق نہیں مگر تفرقہ صرف نیت میں ہوگا۔ کسی کو معبود سمجھ کر کسی کو مخلوق سمجھ کر محض تعظیم کے خیال سے سجدہ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عبادت کی نیت سے خالق کے سوا کسی اور کو سجدہ نہیں ہو سکتا مگر تعظیمی سجدہ ہر اس شخص کے واسطے جائز ہے جو خدا کے نزدیک قابلِ عظمت ہو اور ان کی دلیل یہ ہے کہ آدم کو ملائکہ کا سجدہ سجدہ تعظیمی ہی تھا اور یوسف کو ان کے والد اور بھائیوں کا سجدہ تعظیم ہی کی غرض سے تھا۔ منزلت تھی جناب یوسف کی اور ابھرتی ہوئی منزلت کو بچپن میں خواب میں دیکھا کہ شمس و قمر اور گیارہ ستارے مجھ کو سجدہ کر رہے ہیں۔ اور جب مدت کے بعد باپ سے ملنے کا وقت آیا تو قرآن کی آواز ہے، ”وَحَرُّوْا لَہٗ سُجَّدًا“ اور سب کے سب یوسف کے سامنے سجدے میں گر پڑے اور یوسف کو کہنا پڑا۔

هٰذَا تَاْوِيْلُ رُّؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ۔ اے میرے پدر بزرگوار یہ میرے پچھلے خواب کی تعبیر ہے۔ تو معلوم ہوا کہ جب آدم کو ملائکہ نے سجدہ کیا اور یوسف کو خود جناب یعقوب نے سجدہ کیا تو سجدہ تعظیمی غیر خدا کے واسطے بھی جائز ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سجدہ تعظیمی کا بھی غیر خدا کے لیے جائز ہونا مشکل ہے۔ اس لئے یہ کہنا چاہئے کہ سجدہ تو بہر حال صرف خدا ہی کے لیے ہے۔ البتہ سجدہ کے لیے کبھی کوئی قبلہ معین نہیں بھی ہوتا ہے۔ جیسے اس وقت اگر محض اظہارِ عبدیت کے لیے سر سجدے میں رکھ دیں تو کوئی تخصیص نہیں جس طرف چاہیں پیشانی خم کر دیں۔ یہ وہ سجدہ ہوگا جس کے واسطے قبلہ معین نہیں اور کبھی سجدے کے واسطے قبلہ معین ہوتا ہے جیسے نماز میں کہ جب تک کعبہ کی طرف نہ ہو اس وقت تک سجدہ صحیح نہیں۔ لیکن کبھی یہ قبلہ کوئی جاندار ہوتا ہے اور کبھی بے جان جیسے ہر مسلمان کا سجدہ کعبہ کی طرف جو بے جان ہے اور جیسے ملک کا آدم کو سجدہ جو جاندار تھے یا جناب یعقوب اور ان کے فرزندوں کا سجدہ جناب یوسف کی طرف مگر یاد رکھیے کہ قبلہ بنا کر بھی سجدہ صرف ان ہی چیزوں کی طرف

جائز ہے جن کی طرف پیشانی خم کرنے کا حکم خدا نے دیا ہے۔
اس لیے اگر کوئی بتوں کو سجدہ کرے اور محض قبلہ سمجھ کر تو
بھی جائز نہیں۔ کیوں کہ خدا کا حکم نہیں اور آدمؑ یا کعبہ کو سجدہ
جائز تھا کیوں کہ حکم اسی کا تھا۔ سر کا جھکاؤ آدمؑ کی طرف تھا مگر
اطاعت حکم خالق کی تھی۔

اس مقام پر ایک بات اور عرض کر دوں اور وہ یہ کہ کوئی
اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ جناب یوسفؑ کے کل بھائی متقی نہ
تھے پر ہیزگار نہ تھے۔ کون ان کو نیک کہہ سکتا ہے جو حاسد
ہوں۔ کون اُن کو متقی کہہ سکتا ہے۔ جو اپنے باپ سے اور اس
باپ سے جو نبی ہو جھوٹ بولیں۔ کون ان کو نیک کہہ سکتا ہے جو
یوسفؑ ایسے بھائی کو بلا خطا تکلیف پہنچائیں، اذیت دیں،
ماریں اور قتل پر آمادہ ہوں۔ آخر کنویں میں ڈھکیل دیں۔ اور
جب قافلہ والے جناب یوسفؑ کو کنویں سے نکال لیں تو یہی
بھائی یوسفؑ کو غلام کہہ کر بیچ ڈالیں؟

ان بھائیوں کو کون نیک کہہ سکتا ہے جو اپنے باپ کو اور
اس باپ کو جو پیغمبرؑ ہو، چالیس برس اس شدید رنج میں مبتلا
کریں جس کی آخری حد یہ ہو کہ جناب یعقوبؑ کی بصارت
جاتی رہے۔ ایسے بھائیوں کو کوئی نیک نہیں کہہ سکتا۔ مگر اس کے
باوجود جب جناب یوسفؑ نے بچپن میں خواب دیکھا تو ماں
باپ کی مثال آفتاب و ماہتاب سے دی گئی اور انہیں بھائیوں کو
ستاروں کی صورت سے پیش کیا گیا۔ جناب یوسفؑ فرماتے
ہیں۔ ”إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ“ بابا میں نے آفتاب و
ماہتاب اور گیارہ ستاروں کو دیکھا کہ وہ سب کے سب مجھ کو سجدہ
کر رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ ماں باپ تو شمس و قمر تھے اور ہر
طرح مبارک و سعید مگر گیارہ ستارے جو بھائی تھے ان میں
زائد وہ تھے جو بدکردار اور کم وہ تھے جو پرہیزگار۔ تو جب یہ
معلوم ہو گیا کہ بدکاروں کی مثال بھی ستاروں سے دی جاسکتی

ہے تو اگر بفرض محال پیغمبرؑ فرما بھی دیں کہ ”أَصْحَابِي كَالْجُومِ“ میرے اصحاب ستاروں کی مثل ہیں تو ناز نہ کیجئے۔
ستارے بن جائیں مگر رہیں گے وہی برادران یوسفؑ جو
یعقوبؑ و یوسفؑ دونوں کو اذیت دیں البتہ فخر ہے اور ان کے
لیے جو شمس و قمر بن جائیں۔ بہر حال عرض کرنے کا مقصد یہ تھا
کہ ملائکہ کے سجدے ہوں آدمؑ کے واسطے یا بھائیوں اور باپ
کے سجدے ہوں یوسفؑ کے واسطے نہ وہ سجدہ عبادت تھے نہ
سجدہ تعظیمی تھے بلکہ سجدہ جو کچھ تھا وہ خدا کو تھا۔ صرف رُخ
سجدوں کا غیر خدا کی طرف تھا۔ جیسے ہمارے سجدے کعبہ کی
طرف۔ یہی وہ سجدے ہیں جو اقرار عبدیت کے ساتھ ہوں
خلوص نیت کی آمیزش ہو کمال ایمان کے ساتھ ہوں تو کیا کہنا
ان سجدوں کا جو چہرے کو ضیاء بار کر دیں۔ پیشانی کا نشان ستارہ
بن جائے۔ قرآن مدح شروع کر دے۔ ”سَيِّدَاهُمَا فِي
وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ الشُّجُودِ“ ان کے ایمان کا نشان، ان
کے جنتی ہونے کی سند ان کی پیشانیوں میں ہے سجدوں کے اثر
سے۔ اس وقت بد نما ہوں مگر آخرت میں حسین ہوں گے، اس
وقت سیاہ ہوں مگر محشر میں نورانی ہوں گے۔ آج بُرے معلوم
ہوں مگر قبر میں ضوفشاں ہوں گے۔ جیسے کعبہ میں حجر اسود، یا
پتھر کے اندر ہیرا، یا صدف کے پردے میں موتی یا غنچہ کی مٹھی
میں خوشبو، یا سیاہ بادل میں آفتاب، یا حروف کی سیاہی میں
قرآن کے معانی۔ یونہی ایمان داروں کی پیشانی پر سجدے کا
نشان۔ ظاہری صورت میں دل کشی نہیں مگر باطن کو دیکھئے تو
بہت دل کش۔ مگر یہ تمام دل کش اُس وقت ہے جب خدا کو سجدہ
ہو اور خوشی سے ہو۔ لیکن اگر خالق حقیقی کا سجدہ نہ ہو غیر کو ہو۔
بتوں کو ہو یا خدا کو ہو مگر جبر سے ہو تو رو سیاہی ہے کلنک کا ٹیکہ
ہے۔ جہنم کا پروانہ ہے۔ ہاں ابھی آیت میں ایک بحث اور بھی
ہے۔ صرف اتنا ہی ارشاد نہیں ہوا کہ تمام انسان تمام جن و
ملک، مومن و کافر خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں بلکہ ارشاد ہوتا ہے۔

”فَظْلِهِم بِالْغَدُوِّ دَوْلًا صَالًا“ اور ان کے سائے بھی ہر صبح و شام خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔ تفسیر میں آیت کی اختلاف ہے مفسرین کو۔ اس آیت کے معنی سمجھنے میں دشواریاں ہیں۔ انسان کے سائے کا خدا کو سجدہ کرنا غور و فکر کے قابل ہے مگر میرے خیال میں معنی آیت کچھ زائد دشواریاں نہیں۔ کوئی مجسم چیز ایسی نہیں جس کا سایہ نہ پڑے۔ درخت ہیں تو ان کا سایہ، کوہ و جبل ہیں تو ان کا سایہ، حیوان ہے تو اس کا سایہ، انسان ہے تو اس کا سایہ۔ ادھر چاندنی لنگی ادھر سایہ پڑا۔ ادھر آفتاب چکا ادھر سایہ پیدا ہوا، ادھر نور کے سامنے کوئی تاریک چیز آئی ادھر پر چھائیں پیدا ہوئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ پر چھائیاں بے جان ہیں۔ نافہم ہیں اور عقل و ارادے سے خالی ہیں۔ مگر ان کا طلوع آفتاب و مہتاب کے ساتھ پیدا ہونا اور غروب کے ساتھ ختم ہو جانا۔ آفتاب کی بلندی کے ساتھ ساتھ گھٹنا اور پستی آفتاب کے ساتھ ساتھ بڑھنا اور ہر حالت میں زمین عبودیت پر پھیلنا اور کچھ جانا بتا رہا ہے کہ یہ سائے اسی کی اطاعت میں ہیں جو شمس و قمر کا مالک و خالق ہے اور جس نے آفتاب و مہتاب کو حرکت دے کر سایہ کو مٹایا اور بنایا۔ گویا مطلب باری یہ ہے کہ جاہل اور مغرور انسان ہمارے سامنے سر جھکانا عیب سمجھتا ہے مگر کچھ بھی قدرت ہو تو اپنے سائے کو روک لے منع کر لے۔ جو انتہائی فروتنی کے ساتھ زمین پر بچھا فرماتا ہے۔

ٹھوکریں کھائے یا ہرووں کے زیر قدم آئے مگر جبین نیاز اٹھاتا نہیں۔ اسی انکسار اور اطاعت شعاری کی جزایہ ہے کہ ہم پانی پر قدم رکھیں تو ڈوب جائیں مگر سایہ چادر آب پر کروٹیں بدلتا رہے اور دریا کی بے باک موجیں ہاتھوں پر سنبھال کر ڈوبنے نہ دیں۔ پانی بر سے یا سطح آب پر کروٹیں بدلے مگر سائے کا دامن بھیگتا نہیں۔

آگ پر پڑ جائے تو جلتا نہیں۔ مٹی میں ہو تو گرد آلود نہیں

ہوتا کیچڑ ہو راہ میں تو خراب نہیں ہوتا۔ کثافت ہو کوئی تو نجس نہیں ہوتا۔ کسی کا پیر پڑ جائے تو دبتا نہیں پکلتا نہیں کوئی لاکھ کوشش کرے تو گرفت میں کسی کی آتا ہی نہیں۔ جب اس کی بارگاہ میں خلوص نیت کے ساتھ سر رکھ دیا تو اس نے بھی اتنا سبک کر دیا کہ نہ کسی پر سائے کا بار پڑا۔ اور نہ کسی کے بار سے کوہ گراں بار ہوا۔ ہر عیب سے دامن بچا کر گزرا اور کسی نجاست سے نجس نہ ہوا ہے تو سایہ ہر چیز کا زمین پر مگر مجال ہے کسی کی کہ سایہ پر پیر رکھ دے۔ ہر گز نہیں۔ میرے سائے پر جب کوئی پیر رکھے گا تو سایہ بلند ہو کر پیر کے اور پر آ جائے گا۔ پیر کے نیچے ہر گز نہ رہے گا۔ گویا تعلیم ہے اس کی کہ تم اگر میری بارگاہ میں سر رکھ دو تو پھر دیکھو کہ بلندی کتنی ہوتی ہے تو معلوم ہوا کہ سایہ ہر وقت سائے کی طرح ساتھ رہ کر سر نیاز جھکانے کی تعلیم دے رہا ہے۔ مگر اس تعلیم کی ضرورت اس کو ہے جو سر بلندی کا خیال کرے۔ لیکن جو شخص خود سر نیاز جھکائے ہے اس کو تنبیہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ شاید اسی لیے رسولؐ کے جسم میں سایہ نہ تھا کہ جسم میں تو سایہ ضرور ہوتا ہے مگر سائے میں سایہ ممکن نہیں۔ ہمارے رسولؐ مجسم سایہ رحمت باری تھے لہذا سائے کا سایہ نظر نہ آیا۔ یا یوں عرض کروں کہ خدا نے آپ کو مجسم رحمت بنا دیا تھا۔ ”وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ“ اے رسولؐ تم تمام عالموں کے لیے رحمت ہو اور رحمت جسم و جسمانیات سے بری ہے۔ اور جس میں جسم نہ ہو اس کا سایہ نہیں پڑتا لہذا اگر رسولؐ کا سایہ ہوتا تو رحمت کے حقیقی مصداق نہ ہوتے۔ اور جب سایہ نہ پڑا تو ظاہر ہو گیا کہ رحمت کے مکمل مصداق تھے۔ اور یا یوں عرض کروں کہ سایہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب نور کے سامنے ظلمت ہو یا کوئی تاریک چیز ہو۔ لیکن اگر نور کے مقابلے میں نور ہو تو کبھی پر چھائیں پیدا نہ ہوگی۔ لہذا اگر دھوپ میں چلنے کے بعد جسم رسولؐ سے پر چھائیں پیدا ہوتی تو رسولؐ کے نورانی ہونے میں شبہ ہوتا

لیکن جب آفتاب کی روشنی میں راستہ چلے اور جسم رسولؐ نے سایہ نہ دیا تو قول رسولؐ چمک اٹھا۔ ”أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللَّهُ نُورِي“ سب سے پہلے خدا نے میرا نور خلق کیا۔ خیال ہو سکتا ہے کہ اول مخلوقات صرف ذاتِ باریکات محمدیؐ ہی تھی۔ اسی لیے رسولؐ نے ارشاد فرمایا کہ ”أَنَا وَ عَلِيٌّ مِنْ نُورٍ وَاحِدٍ“ میں اور علیؑ دونوں ایک نور سے ہیں اور پھر سیدہ زہراؑ عالم کے واسطے ارشاد ہوا۔ ”فاطمہ میرے دل کا ٹکڑا ہے۔“ پھر امام حسینؑ کے واسطے ارشاد فرمایا ”حُسَيْنٌ مِنِّي وَ أَنَا مِنْ الْحُسَيْنِ“ میں حسینؑ سے ہوں اور حسینؑ مجھ سے ہے۔ اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ آخر میں فرمایا۔ ”أَوَّلُنَا مُحَمَّدٌ وَ أَوْسَطُنَا مُحَمَّدٌ وَ آخِرُنَا مُحَمَّدٌ“ ہمارا پہلا بھی محمدؐ، ہمارا اوسط بھی محمدؐ، ہمارا آخر بھی محمدؐ۔ ہم سب کے سب محمدؐ۔ تو اب جو کچھ ظلم سیدہؑ پر ہوئے۔ وہ سب محمدؐ پر تھے۔ جو ظلم حسنؑ و حسینؑ پر ہوئے وہ سب محمدؐ پر تھے اور جب امام حسینؑ علی اکبرؑ کے واسطے فرمائیں کہ میرا یہ فرزند صورت میں، سیرت میں، رفتار میں گفتار میں بالکل رسولؐ سے مشابہ ہے تو میں کیوں عرض نہ کروں کہ یزید کے لشکر نے علی اکبرؑ کو قتل نہیں کیا بلکہ رسولؐ کو شہید کیا۔ اسی لیے اس شاہزادے کی رخصت میں جو عالم امام حسینؑ کا ہوا وہ کسی کی رخصت میں نہیں ہوا۔ پہلے تو یہ میں نے کسی کی کتاب میں نہیں دیکھا کہ امام حسینؑ نے بنی ہاشم میں کسی سے کہا ہو کہ اہل حرم سے رخصت ہو مگر جب جناب علی اکبرؑ نے اجازت میدان طلب کی تو ارشاد فرمایا کہ آخری مرتبہ اہل حرم سے رخصت ہو لو۔ معلوم نہیں امام مظلومؑ نے نورِ نظر کو یہ حکم کیوں دیا؟ ممکن ہے اس لیے فرمایا کہ اولاد پر ماں کا بھی حق ہے لہذا ضروری ہے کہ ماں سے اجازت لے لیں اور زینبؑ نے بھی بڑی محنت سے پالا تھا ان سے اجازت لینا بھی ضروری ہے۔ یا اس لیے کہ آخری مرتبہ اہل حرم شبیہ رسولؑ کی زیارت کر لیں۔ اب دوبارہ یہ چاندی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوگی۔ میں نے

کہیں نہیں دیکھا کہ جناب علی اکبرؑ نے ماں کو کیوں کر سمجھایا۔ بہن کو گلے لگا کر کیونکر رخصت کیا۔ جس پھوپھی نے اٹھارہ برس محنت و مشقت سے پالا تھا اس پھوپھی سے کیونکر اجازت لی۔ اپنے بھائی سے بھی آخری مرتبہ رخصت ہوئے یا نہیں؟ البتہ حمید ابن مسلمؒ کہتا ہے کہ میں دیکھ رہا تھا کہ خیمہ کا پردہ اٹھتا تھا اور پھر گرتا تھا۔ جب میں نے غور سے دیکھا تو یہ دیکھا کہ جب علی اکبرؑ چاہتے ہیں کہ خیمہ سے باہر نکلیں تو اہل حرم لپٹ جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سب سے زیادہ سکینہؑ بے چین ہو ہو کے پیروں سے لپٹی ہوگی کہ بھئی اس بے کس بہن کو کس پر چھوڑتے ہو۔ میرے بھائی اب تو چچا عباسؑ بھی نہیں۔ کون میرا خیال کرے گا۔ بہر حال علی اکبرؑ نے سب کو تسلی دی۔ دلاسا دیا۔ سب کو سمجھا بچھا کر خیمہ سے باہر نکلے۔ باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خیال رسائی نہیں کرتا۔ تصورات کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ کسی کی یہ مجال ہی نہیں کہ جب جوان فرزند شبیہ رسولؐ سب کو رخصت کر کے حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوگا اور عرض کی ہوگی۔ بابا! سب سے مل چکا اب آپ بھی اجازت دیں تو باپ کے دل پر کیا گزر گئی ہوگی؟ مجھ کو تو یقین ہے کہ کوئی اور ہوتا تو سنبھل نہ سکتا اور غش کھا کر گر پڑتا اور دل کی قوت سنبھال بھی لیتا تو بیٹے سے پہلے خود مرنے پر آمادہ ہو جاتا کیوں کہ ہر باپ کی تمنا ہوتی ہے کہ میں مرجاؤں اور میری اولاد جنازہ اٹھائے۔ مگر حسینؑ سا صابر رضائے الہی میں سر جھکائے ہوئے انبیاء و مرسلینؑ کے صبر کی حدوں سے آگے بڑھ کے جوان فرزند کو میدان شہادت کی اجازت دیتا ہے۔ پہلے تو آسمان کی طرف نظر کر کے فرماتے ہیں۔ بارالہا! تو گواہ رہنا کہ اب وہ جوان مرنے جاتا ہے جو صورت و سیرت میں تیرے رسولؐ سے مشابہ ہے۔ جب ہم رسولؑ کی زیارت کے مشتاق ہوتے تھے تو اس جوان کی صورت دیکھ لیتے تھے۔ اس کے بعد عمر سعدؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد کیا کہ پسر سعد! خدا

تیری نسل کو بھی یونہی قطع کرے جس طرح تو نے میری نسل قطع کی۔ اب علی اکبرؑ نے جوش شجاعت میں گھوڑے کو ایڑ دی۔ اور حسینؑ کیچہ سنبھال کر گھوڑے کے پیچھے چلے۔ تھوڑی دور آگے بڑھ کر علی اکبرؑ نے پلٹ کر دیکھا کہ ضعیف باپ پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے۔ باگ روک کر عرض کی بابا آپ تو مجھے رخصت کر چکے تھے۔ فرمایا۔ ہاں نور نظر۔ مگر دل نہیں مانتا۔ جب تک تیرا میرا سامنا رہے مڑ کر دیکھتا جا کہ میں تیری صورت دیکھتا رہوں۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا کہ جب تک لشکر کی صفوں نے آڑ نہ کر لی ہوگی علی اکبرؑ مڑ کر دیکھتے رہے ہوں گے اور حسینؑ بار بار اپنے لختِ جگر کی صورت دیکھتے رہے ہوں گے۔

مگر جب لشکر کی صفوں نے آڑ کر لی اور جنگ شروع ہو گئی تو اب کہاں موقع تھا کہ علی اکبرؑ مڑ کے دیکھیں اب تو حسینؑ دل سنبھالے ہوئے میدان میں کھڑے تھے اور شبیہ رسولؐ علیؑ کی طرح ہزاروں کے لشکر سے جنگ کر رہا تھا کہ ایک مرتبہ امام حسینؑ کی نگاہ خیمے کی طرف اٹھ گئی۔ دیکھا علی اکبرؑ کی ماں جناب لیلیٰ نظر جمائے ہوئے حسینؑ کے چہرے کو دیکھ رہی ہیں۔ جناب لیلیٰ نے امامؑ کے چہرے پر تغیر دیکھا اور گھبرا کے پوچھا۔ کیوں مولا میرا بچہ تو خیریت سے ہے؟ امام حسینؑ نے شاید یہ چاہا کہ لیلیٰ کو درخیمہ سے ہٹا دیں، اس لیے فرمایا۔ تیرا بچہ تو ابھی تک خیریت سے ہے لیکن ایک بہت بڑا پہلوان مقابلے پر آیا ہے۔ لیلیٰ میرے نانا کی حدیث ہے کہ ”ماں کی دعاء بچے کے حق میں قبول ہوتی ہے۔“ جاؤ لیلیٰ خیمے کے اندر جا کر علی اکبرؑ کے واسطے دعاء کرو۔ میرا دل کہتا ہے کہ ماں نے خیمے کے اندر آ کے سر کے بال کھولے ہوں گے۔ بچوں کو بلایا ہوگا کہ آؤ آؤ۔ میں دعاء کروں۔ تم سب آمین کہو۔ ادھر ماں نے تڑپ تڑپ کر دعاء کی ادھر علی اکبرؑ نے اُس پہلوان کو ایک ہی وار میں فی النار کیا۔ مگر اب دشمن چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔ عزاداران حسینؑ! اغیار نے جناب عباسؑ کے جہاد کی

وہ صورت نہیں بیان کی بلکہ امام حسینؑ کے جہاد کی بھی یہ شان نہیں لکھی۔ لیکن علی اکبرؑ کے جہاد کی سب نے تعریف کی ہے۔ شاید اس لیے کہ امامؑ نے فرما دیا تھا کہ علی اکبرؑ رسولؐ کی شبیہ ہیں۔ لہذا علی اکبرؑ نے ثابت کر دیا کہ میرے جد بزرگوار کی شجاعت دیکھنا ہو تو مجھ کو دیکھو۔ تین دن کی پیاس، قیامت کی گرمی، جوانی کا عالم، دشمنوں کی کثرت۔ اس عالم میں بھی ایک سو بیس آدمیوں کو قتل کیا۔ اب پیاس کی شدت ہوئی۔ راستہ روکنے والی فوجوں کو مار کر ہٹا دیا۔ راستہ صاف ہوا تو باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کرتے ہیں کہ زخموں کی کثرت، دھوپ کی شدت، زرہ کی گرانی مارے ڈالتی ہے۔ بابا! اگر تھوڑا پانی مل جائے تو میں دکھا دوں کہ بنی ہاشم کے جوان کیونکر لڑتے ہیں۔ اولاد والو! اب تم ہی بتاؤ۔ ذرا انصاف کرو کہ حسینؑ کے دل کی کیا حالت ہوگی۔ یقیناً علی اکبرؑ کی زبان سے نکلی ہوئی لفظیں دل کو براگئی ہوں گی مگر واہ رے صبر اور واہ ری ہمت اور راضی برضائے الہی رہنے کا مظاہرہ کہ اعجاز کی قوت موجود ہونے کے باوجود بیٹے سے ارشاد کرتے ہیں کہ نور نظر پانی تو نہیں ممکن مگر اپنی زبان میرے منہ میں دے دو۔ علی اکبرؑ نے زبان منہ میں دی اور فوراً زبان باہر نکال لی اور عرض کی کہ بابا آپ کی زبان تو میرے سے بھی زیادہ خشک ہے۔

عزاداران حسینؑ! چاہئے تو تھا کہ امام حسینؑ اپنی زبان علی اکبرؑ کے دہن میں دیتے جیسے رسولؐ نے اپنی زبان علیؑ کے دہن میں دی تھی۔ مگر نہیں حسینؑ نے اپنی زبان علی اکبرؑ کے منہ میں نہیں دی بلکہ علی اکبرؑ سے کہا کہ اپنی زبان میرے منہ میں دے دو۔ شاید اس لیے کہ حسینؑ نے بچپن میں سیکڑوں مرتبہ رسولؐ کی زبان چوسی تھی اور علی اکبرؑ شبیہ رسولؐ تھے۔

لہذا چاہا کہ آخری مرتبہ پھر رسولؐ کی زبان منہ میں لے کر تسلیٰ کر لوں۔ یا ممکن ہے کہ حسینؑ کی زبان اتنی خشک تھی کہ منہ سے باہر نہ نکال سکتے تھے۔ بہر حال اب امامؑ نے علی اکبرؑ کو

ایک انگوٹھی دی اور فرمایا کہ نورِ نظر یہ انگوٹھی منہ میں رکھو شاید کچھ تسکین ہو جائے۔ اب تمہارے نانا تم کو آبِ کوثر سے سیراب کریں گے۔ علی اکبرؑ نے انگوٹھی منہ میں رکھی۔ دوبارہ باپ سے رخصت ہوئے۔ میدان میں آئے۔ شدت کی پیاس میں دوبارہ حملہ کیا اور اسی آدمی اور قتل کر دیے۔ آخر میں زخم بڑھنے لگے قوت گھٹنے لگی۔ اس عالم میں ایک نیزہ سینے پر پڑا اور علی اکبرؑ گرنے لگے۔ مگر واہ ری شجاعت، واہ ری بہادری کہ گھوڑے سے گرنا گوارا نہ کیا۔ دونوں باہیں گھوڑے کے گلے میں ڈال دیں۔ دشمن نے مجبور پا کے چاروں طرف سے حملہ کرنا شروع کر دیے یہاں تک کہ روایت میں ہے کہ علی اکبرؑ گو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اب علی اکبرؑ زمین پر گرے اور گرتے گرتے آواز دی ’یَا اَبَتَاکَ عَلَیْکَ مِیِّ السَّلَامَ‘ ”بابا! میرا آخری سلام لیجئے۔ بس یہ سننا تھا کہ امام حسینؑ نے دل سنبھالا۔ نورِ نظر کی تلاش میں یا علیؑ یا علیؑ کہتے ہوئے آگے بڑھے۔ ممکن ہے کہ علی اکبرؑ ہی کو پکار رہے ہوں۔ کہ نورِ نظر کہاں ہو۔ پھر آواز دو کہ ضعیف باپ سر ہانے پہنچ سکے۔ اور یا جس طرح آپ ہر مصیبت میں علیؑ کو پکارتے ہیں یوں ہی حسینؑ بھی پکار رہے تھے کہ بابا اب تک میں نے صبر کیا۔

ہاتھ کمر کے نیچے دے کر جوان کی میت اٹھائی۔ چند قدم لے کر چلے مگر اب قوت نے جواب دے دیا مجبور باپ نے لخت جگر کی میت جلتی زمین پر رکھ دی۔ چاروں طرف حسرت سے دیکھا نہ کوئی دوست نظر آیا نہ عزیز قاسم نہ عباس دیکھا کچھ بچے خیمے سے نکل آئے ہیں۔ امام حسینؑ نے آواز دی کہ اطفالِ بنی ہاشم آؤ۔ اپنے بھائی کی میت لے چلو۔ بچوں نے ہاتھ لگایا اور حسینؑ نے جوان کی میت شہداء کی لاشوں میں لا کر لٹا دی۔

(ماخوذ از پندرہ روزہ ارشاد کراچی، سید الشہداء نمبر، ۶/۱ اپریل ۱۹۶۷ء ص ۱۹ تا ۲۲)

زیادہ دربارِ شام میں وہ کیا جو اس مرحلہ سے زیادہ دشوار تھا جس کو حسینؑ اور انصارِ حسینؑ نے کربلا کے میدان میں سر کیا۔ مدینہ سے روانگی کے وقت حسینؑ نے غور کیا کہ میری شہادت کے بعد کون ایسا ہے جو میری مظلومی کا اعلان ظالم کے تختِ حکومت کے نزدیک بیٹھ کر کر سکتا ہے تو حسینؑ نے فیصلہ کر لیا کہ یہ دل و جگر علیؑ کی بڑی سیٹی زینب کبریٰ کا ہے چنانچہ زینبؑ کو حسینؑ اس مصلحت کی خاطر ہمراہ لائے اور آخری وقت اس خدمت کو حسینؑ نے زینب کے سپرد کیا اور حقیقت زینب نے کوفہ کی بازاروں میں شام کے راستوں میں دربارِ ابنِ زیاد میں دربارِ یزید میں مظلوم کی مظلومی اور ظالم کے ظلم کا اعلان فرمایا۔ تاکہ اندھی دنیا پہچان لے کہ یزید باطل پر تھا اور حسینؑ حق پر گامزن۔ مختصر یہ کہ یزید جس کو زمین نینوا پر ظلم و جور کے ساتھ بظاہر فنا کر چکا تھا۔

زینب بنت علیؓ نے اسے زندہ جاوید کر دیا۔
وہ تھے حسینؓ۔ یہ ہیں زینبؓ جن کے پائے استقلال کو
بھی یزید کے انتہائی مظالم مقررزل نہ کر سکے۔

شہدائے کربلا

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقوی

(۵۴) مسلم بن کثیر اعرج

اتنے ہی الفاظ میں ان کا نام رجال شیخ طوسی میں اصحاب امام حسینؑ کی فہرست میں درج ہے لیکن ان کا نام و نسب حسب ذیل ہے:-

مسلم بن کثیر بن قلیب صدفی ازدی، قبیلہ ازدشنو، میں سے۔ اعرج یعنی لنگ تھے۔ جنگ جمل میں امیر المومنینؑ کی نصرت میں شریک جنگ رہے اور پنڈلی پر تیر پڑا جس کا اثر ہمیشہ رہا۔ انہوں نے زمانہ رسالتؐ کا ادراک بھی کیا تھا۔^(۱)

کوفہ سے نصرت امام حسینؑ کے لئے روانہ ہوئے اور کربلا میں آکر قدمبوس ہوئے۔^(۲) حملہ اولیٰ میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔^(۳)

’ناسخ‘ میں مناقب کے حوالہ سے شہداء حملہ اولیٰ میں ان کا نام اسلم بن کثیر ازدی اعرج لکھا ہے۔^(۴) اس کا ماخذ زیارت شہداء کا پیش نظر نسخہ ہے جس میں سلام اس طرح ہے:-

”السلام علی اسلم بن کثیر الازدی۔“

صاحب ناسخ نے بھی زیارت کو اسی صورت سے نقل کیا ہے بلکہ اس میں ’الازدی‘ کے بعد ’الاعوج‘ کی لفظ کا اضافہ کیا ہے جو ’الاعرج‘ کی خرابی ہے۔ لیکن یہ سب روایتی تحریفیں ہیں جن کی اصل وہی ایک ہے۔“

(۱) تنقیح المقال، ج ۳ ص ۲۱۵ (۲) ابصار العین، ص ۱۰۸

(۳) مناقب، ج ۴ ص ۹۹ (۴) ناسخ التواریخ، ج ۶ ص ۳۶۸

(۵۵) مقسط بن زہیر بن حارث تغلبی

یہ اور ان کے دو بھائی قاسط اور کردوس، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اصحاب امیر المومنینؑ میں تھے اور حضرت کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے۔ کربلا میں خفیہ طریقہ پر نصرت امام حسینؑ کے لئے آئے اور حملہ اولیٰ میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔^(۱)

رجال شیخ طوسیؒ میں ان کا ذکر اصحاب امام حسینؑ میں موجود ہے۔ بیشک علامہ مامقانی کا یہ تعجب حق بجانب ہے کہ زیارت شہداء میں قاسط اور کردوس ان کے دونوں بھائیوں پر سلام موجود ہے لیکن ان کا کوئی ذکر نہیں۔^(۲) ممکن ہے یہ راویوں کے حذف واسقاط کا نتیجہ ہو۔

(۵۶) منیع بن زیاد

علامہ مامقانی زیارت رجبیہ سے ان پر سلام کا حوالہ دیتے ہیں اور یہ کہ ان کا نام وہاں ”منیع بن زیاد“ ہی درج ہے لیکن رجال شیخ طوسیؒ میں اصحاب امام حسینؑ کے ذیل میں ”منیع بن رقاد“ لکھا ہے۔^(۳)

(۵۷) نصر بن ابی نمیر

ابونمیر نجاشی بادشاہ حبشہ یا کسی اور ملک عجم کے بادشاہ کی نسل سے تھے۔ بچپن میں شرف اسلام سے بہرہ اندوز ہونے کا شوق پیدا ہوا۔ رسالتؐ کی خدمت میں لائے گئے اور اسلام لائے۔ حضرت نے ان کی تربیت کی۔ آپ کی وفات

(۱) ابصار العین، ص ۱۱۵ (۲) تنقیح المقال، ج ۳ ص ۲۴۶

(۳) تنقیح المقال، ج ۳ ص ۲۵۲

الخزرجی، وہ اور ان کے دو بھائی نصر اور نعمان اصحاب امیر المومنینؑ میں سے تھے اور جنگ صفین میں کارنمایاں انجام دیئے تھے اور یہ تینوں شجاعان روزگار اور شعراء میں سے تھے۔^(۱)

نعمان بن عجلان کو امیر المومنینؑ نے عمرو بن ابی سلمہ مخزومی کو معزولی کے ساتھ بحرین کا حاکم مقرر کیا۔^(۲)

نصر اور نعمان دونوں نے امام حسنؑ کی خلافت کے زمانہ میں انتقال کیا اور نعیم کوفہ میں قیام پذیر رہے۔ جب امام حسینؑ سرزمین عراق پر پہنچے تو وہ کوفہ سے نکل کر خدمت امام میں آئے۔^(۳)

اور روز عاشور حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔^(۴)
زیارت شہداء میں ان پر سلام ہے:-

”السلام علی نعیم بن عجلان الانصاری۔“
یہاں پر حملہ اولیٰ کے پچاس شہداء کی تعداد پوری ہوگئی۔ مذکورہ بالا تفصیل اس اجمالی فہرست سے کافی اختلاف رکھتی ہے جو محاربہ کربلا میں درج کی گئی تھی۔ یہ تجدید نگاہ اور ذوق تحقیق کا لازمی نتیجہ ہے۔ آئندہ کے ایڈیشن میں اس فہرست کو اسی تفصیل کے مطابق کر دینا چاہئے۔
اب وہ لوگ ہیں جو حملہ اولیٰ کے بعد سے نماز ظہر تک شہید ہوئے:-

(۶۰) بکر بن جی بن تیم اللات بن ثعلبہ تیمی
عمر سعد کی فوج کے ساتھ کربلا آئے تھے مگر جنگ چھڑنے کے بعد توفیق الہی دستگیر ہوئی اور امام حسینؑ کے ساتھ آکر شریک جہاد ہو گئے حملہ اولیٰ کے بعد درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔^(۵)

(۱) تنقیح المقال، ج ۳ ص ۲۷۴ (۲) نبح البلاغ، مطبوعہ مصر، ج ۳ ص ۶۹

(۳) تنقیح المقال، ج ۳ ص ۲۷۴ (۴) مناقب، ج ۴ ص ۹۹

(۵) البصار لعین، ص ۱۱۳

کے بعد وہ امیر المومنینؑ کی خدمت میں رہے اور آپ کے ایک مملوکہ نخلستان میں اصلاح و تربیت پر مامور ہوئے۔ کامل میں ان کے حالات کا تذکرہ ہے اور ان کی زبانی ایک خاصی طویل روایت امیر المومنینؑ کے چشمہ برآمد کرنے اور اسے وقف کرنے کے بارے میں درج کی گئی ہے۔

ان کے فرزند نصر نے کمسنی اور نوجوانی امیر المومنینؑ اور امام حسنؑ کے ساتھ گزاری اور آخر میں امام حسینؑ کی غلامی میں رہے یہاں تک کہ سفر عراق میں حضرت کے ساتھ مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا آئے۔ حملہ اولیٰ میں ان کا گھوڑا کام آیا۔ پھر وہ خود درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔^(۱)

ابن شہر آشوب نے حالات امیر المومنینؑ کے ذیل میں غلاموں کی فہرست میں سعد اور نصر کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

”قتل مع الحسین“

امام حسینؑ کے ساتھ شہید ہوئے۔^(۲)

(۵۸) نعمان بن عمرو ازدی راسبی

کوفہ کے باشندہ، اصحاب امیر المومنینؑ میں سے تھے اور امیر المومنینؑ کے ساتھ جنگ صفین میں شریک بھی ہوئے تھے۔ شیخ طوسی نے ان کا نام اصحاب امام حسینؑ میں درج کیا ہے۔^(۳)

ان کے بھائی حلاس بن عمرو ازدی کا تذکرہ پہلے آچکا ہے۔ کربلا میں دونوں بھائی عمر سعد کی فوج کے ساتھ آئے اور شرائط صلح مسترد ہونے پر آپ کے امام سے ملحق ہوئے۔^(۴)
حملہ اولیٰ میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔^(۵)

(۵۹) نعیم بن عجلان انصاری

نعیم بن عجلان بن نعمان بن عامر بن ذریق الانصاری الزرقی

(۱) البصار لعین، ص ۵۵-۵۴ (۲) مناقب، ج ۳ ص ۱۶۲

(۳) تنقیح المقال، ج ۳ ص ۲۷۴

(۴) البصار لعین، ص ۱۰۹ (۵) مناقب، ج ۴ ص ۹۹

(۶۱) عمرو بن جنادہ بن کعب خزرجی

ان کے باپ جنادہ بن کعب کا تذکرہ حملہ اولیٰ کے مقتولین میں ہو چکا ہے۔ عمرو بن جنادہ کا میدان کربلا میں تو دس برس کا سن تھا۔^(۱)

ان کی شہادت کا واقعہ میں نے ’محاربہ کربلا‘ میں تفصیل سے لکھا ہے۔

بچہ کا خدمت امام میں آ کر طلب رخصت ہونا اور امام کا توقف فرمانا اور یہ کہنا کہ اس کے قتل سے اس کی ماں کو تکلیف پہنچے گی اور بچہ کا کہنا کہ مجھے میری ماں ہی نے بھیجا ہے اور مجھے جنگ کا لباس انہوں ہی نے پہنایا ہے۔ یہ تمام اس روایت کے اجزاء ہیں جو مسلم بن عوسجہ کے فرزند کی طرف منسوب کی جاتی ہے اور عام طور سے ذاکرین کی زبان پر آیا کرتی ہے۔ اس کے متعلق میں نے سابق میں مسلم بن عوسجہ کے حالات میں تبصرہ کیا ہے۔

عمرو بن جنادہ کے قتل ہونے پر دشمنوں نے ان کا سر کاٹ کر خیام حسینی کی طرف پھینک دیا۔ بیوہ ماں نے فرزند کا سراٹھالیا اور شاباشی دی پھر اس سر کو فوج دشمن کی طرف پھینک دیا اور خود عمود خیمہ لے کر میدان جنگ میں آ گئی۔ امام نے اسے گوارا نہ کیا اور اس عورت کو خیمہ کی طرف واپس کرادیا۔

ابن شہر آشوب نے عمرو بن جنادہ کے بعد ایک دوسرے نو جوان کی طرف اس واقعہ کو منسوب کیا ہے۔ انھوں نے جنادہ بن حارث انصاری کی شہادت کے بعد ان کے فرزند کے واقعہ کو صرف اس جملہ میں ختم کیا ہے کہ

”ثم برز ابنه فاستشهد ثم برز فتى قائلا:- اميرى حسين و نعم الامير سرور فواد البشير النذير۔“

”پھر ان کا فرزند میدان جنگ میں آیا اور شہید ہوا (یعنی)

(۱) تنقيح المقال، ج ۲ ص ۳۷۷

پھر ایک جوان میدان میں آیا یہ رجز پڑھتا ہوا کہ امیری حسین و نعم الامیر۔ الخ

اور اس روایت کے تتمہ میں درج کیا ہے کہ اس جوان کا سر کاٹ کر اس کی ماں کی جانب پھینک دیا اور وہ میدان جنگ میں آ گئی۔^(۱) اس میں رخصت کے وقت کی صورت امام کا اجازت دینے سے انکار کرنا اور بچہ کا کہنا کہ میری ماں نے بھیجا ہے یہ سب مذکور نہیں۔

صاحب ’ناخ‘ نے اس گنہگار جوان کی شہادت کا عمرو بن مطاع جعفی کی شہادت کے بعد تذکرہ کیا اور وہاں یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ اس جوان کا باپ میدان جنگ میں قتل ہو چکا تھا اور وہ ماں کے کہنے سے میدان جنگ میں آیا اور امام نے منع کیا اس لحاظ سے کہ اس کی ماں اس کو برداشت نہ کر سکے گی اور جوان نے کہا کہ میری ماں ہی نے مجھ کو بھیجا ہے۔ وہ میدان جنگ میں آیا اور وہی رجز پڑھی:

امیری حسین و نعم الامیر۔۔۔ الخ
پھر اس کا سر قلم کر کے خیام حسینی کی طرف پھینکا گیا اور ماں نے اٹھالیا پھر فوج دشمن کی طرف پھینک دیا اور خود میدان جنگ میں آ کر لڑنے لگی۔ لیکن امام نے واپس بلا لیا۔^(۲)

اب یہ روایت بالکل عمرو بن جنادہ والی روایت سے متحد ہو گئی۔ مگر انھوں نے عمرو بن جنادہ کی شہادت کا تذکرہ پھر اس کے بعد ان کے باپ جنادہ بن حارث کی شہادت کے بعد کیا ہے۔ اور ان کی ایک بالکل خاص الخاص نئی رجز بھی لکھی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

اضق الخناق من ابن هند وارمه
من عامة بغوارس الانصار^(۳)
یہ اشعار بالکل رجز کے انداز سے علحدہ ہیں اور ذوق سلیم

(۱) مناقب، ج ۴ ص ۹۵ (۲) ناخ التواريخ، ج ۶ ص ۷۳

(۳) ناخ، ج ۶ ص ۷۴

ان کی صحت سے انکار رکھتا ہے۔

(۶۲) یزید بن حصین مشرقی

کوفہ کے رہنے والے بڑے عبادت گذار انسان اور شجاع و بہادر تھے۔ شیخ طوسی نے انھیں اصحاب امام حسینؑ میں محسوب کیا ہے۔ جناب مسلم بن عقیل کے کوفہ آنے پر ان کی بیعت کی اور مسلم کے قتل ہونے پر یہ کوفہ سے باہر نکلے اور امام حسینؑ سے جا کر ملحق ہوئے۔ کربلا میں جب فرزند رسولؐ پر پانی بند کیا گیا تو یزید بن حصین نے امام سے اجازت طلب کی کہ عمر سعد کے پاس جا کر پانی کے باب میں گفتگو کریں۔ امام نے اجازت دی۔ وہ عمر سعد کے پاس آئے اور گفتگو کی جو ناکام ہوئی۔ آخر اپنی جگہ پر واپس آئے روز عاشورہ نماز ظہر کے قبل جہاد کر کے شہید ہوئے۔^(۱)

زیارت شہداء میں ان پر سلام بایں الفاظ ہے:-

”السلام علی یزید بن حصین الہمدانی
المشرفی القاری المجدل بالمشرقی۔“

صاحب ’ناخ‘ نے نام ان کا ان شہداء میں درج کیا ہے جنہیں مورخین محدثین نے نہیں لکھا ہے اور صرف زیارت میں ان کے نام کا تذکرہ ہوا ہے۔^(۲)

مجھے بعض قرائن کی بناء پر یہ شبہ پیدا ہو رہا ہے کہ یزید بن حصین نام کے کوئی شہید نہیں تھے بلکہ یہ ”بریر بن خضیر“ ہمدانی کے نام کی مغلوں کی صورت ہے۔ ممکن ہے آئندہ میرا یہ شبہ یقین کا درجہ حاصل کر لے اور یہ نام بالکل ساقط ہو جائے۔

(۶۳) حبیب ابن مظاہر اسدی

نام و نسب

حبیب بن مظاہر بن رباب بن اشتر بن نجوان بن
فقہ بن طریف بن عمرو بن قیس بن حارث بن ثعلبہ

(۱) تنقیح المقال، ج ۳ ص ۳۳۵ (۲) ناخ التواریخ، ج ۶ ص ۲۷۹

بن دودان بن اسد کنیت ابو القاسم۔ قبیلہ کے لحاظ سے اسدی فقہی کہلاتے تھے اور عرب کے مشہور شہسوار شاعر ربیعہ بن حوط بن رباب کے چچا زاد بھائی تھے۔

طبقتہ

ابن کلبی کی روایت کے مطابق وہ صحابی تھے اور رسولؐ کی زیارت کی تھی۔^(۱)

شیخ طوسی نے انہیں اصحاب امیر المومنینؑ اور پھر اصحاب امام حسنؑ اور اصحاب امام حسینؑ تینوں بابوں میں درج کیا ہے۔^(۲)

باپ کے نام کی تحقیق

حبیب کے باپ کا نام جو زبان زد خلایق ہے وہ ”مظاہر“ الف کے ساتھ مگر بعض اقوال اس کے خلاف ہیں۔

فاضل سماوی لکھتے ہیں (مظہر) بضم المیم و فتح الطاء المعجمة بزنة محمد علی الاشهر و یضبط بالطاء المہملۃ فی بعض الاصول و یمضی علی السن و فی الکتب مظاہر و هو خلاف المضبوط قدیمًا۔^(۳)

(یعنی) مظہر سیم کے ضم۔ طاء کے فتح کے ساتھ ’محمد‘ کے وزن پر ہے جیسا کہ زیادہ تر مشہور ہے اور بعض ماخذوں میں اس کی ’مظہر‘ طائے غیر منقوطة کے ساتھ تعین کی گئی ہے۔ اور عام طور سے زبانوں پر اور کتابوں میں ”مظاہر“ جاری ہے۔ لیکن یہ اس لفظ کی قدیم تعین کے خلاف ہے۔

اس کے بالکل برخلاف رجال ابن داؤد میں حبیب کا نام درج کرتے ہوئے ان کو ’ابن مظاہر‘ لکھا ہے۔ اور دوسرے قول کو تضعیفی شکل سے اس طرح لکھا ہے کہ قیل مظہر بفتح الطاء وتشدید الہا و کسرہا (یعنی)

(۱) البصار لعین، ص ۵۶ (۲) تنقیح المقال، ج ۱ ص ۲۵۲

(۳) البصار لعین، ص ۶۱

و نحن اعلیٰ حجة والظہر
حقاً واتقوا منکم واعذر (۱)
وہ لکھتے ہیں:

”اُزب ار جوزه کہ از حبیب مرقوم شد معلوم می
شود کہ مظہر نام داشتہ چہ مظاہر خوانیم با سائر
مصرعہا قافیہ نخواہد داشت چہ رعایت الف تاسیس
در نزد عرب از شرائط صحت قافیہ است بر خلاف
عجمان کہ شرط نمیدانند واللہ اعلم۔“ (۲)

لیکن یہ استدلال ان کا بہت کمزور ہے۔ اول تو روایتی
نقطہ نظر سے ان رجزوں کو جو جنگ کے میدانوں میں مختلف
پہلوانوں کی طرف منسوب میں اتنا تاریخی اعتبار حاصل نہیں
ہے جتنا دوسرے واقعات کو اس کے قرائن شواہد بہت ہیں جن
کے لکھنے کے لئے اس وقت تیار نہیں ہوں۔ دوسرے میدان
جنگ کے رجز ہمیشہ وقتی حیثیت ہے اور صرف ایک جوش قلبی
کے مظاہرہ یا ایک رسم کے ادا کرنے کی صورت سے ہوا کرتے
تھے۔ ان میں نہ شاعرانہ ہنرمندیوں کا لحاظ ہوتا تھا اور نہ ہر
جنگ آزمامرد میدان کے لئے شاعری کے فن میں کامل ہونے
کی ضرورت تھی۔ اسی بنا پر اس کے لیے بحر ’رجز‘ منتخب کی گئی
جس میں لا انتہا وسعت حاصل ہے اور سیدھے ٹیڑھے آڑے
بیڑے الفاظ بھی سب اس میں آکر موزوں ہو جاتے ہیں۔
شعراء نے اس بحر کو اسی بناء پر فن شاعری کی سلیقہ مندیوں سے
اس درجہ اجنبی سمجھا کہ اس کا نام ”جمار الشعراء“ رکھ لیا اور قصائد
وغیرہ کے لئے جو شاعری کے کارناموں کا میدان ہیں اس بحر
سے بہت کم کام لیا۔

تیسرے الف تاسیس کا لحاظ عربی میں اگرچہ بایں معنی
ضروری ہے کہ اگر قافیہ مبنی بر الف تاسیس قرار دیا گیا ہے جیسے
عالم قائم دائم وغیرہ تو اس میں ایسا قافیہ نہیں ہونا چاہیے جس

کہا گیا ہے کہ مُظہر ظاء کے فتح اور ہاء کے تشدید اور کسرہ کے
ساتھ ہے۔ پھر پہلے قول کی اس طرح تقویت کی ہے کہ
والاول بخط الشيخ رحمة الله لیکن اول
(مظاہر) خود شیخ طوسی کے قلم کی تحریر میں درج ہے:-
شہید ثانی کے حواشی خلاصہ میں لکھا ہے:-

”قال ابن طاووس انه وحده مظاہر بخط عمید
الرؤساء۔“

”سید ابن طاووس کا بیان ہے کہ مظاہر میں نے کاتب
ابن عمید کے قلم کی تحریر میں دیکھا ہے۔“

اس کی تصریح سید ابن طاووس کی کتاب ’تحریر
طاووس‘ کے حاشیہ پر موجود ہے۔

علامہ مامقانی نے اس موقع پر اچھا محاکمہ کیا ہے۔
انھوں نے شیخ الطائفہ اور عمید الروساء کی قلمی تحریروں کے اسناد
پر ”مظاہر“ کو اصح قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ زیادہ تر مشہور
زبانوں پر جاری اور زیارات میں منقول یہی ہے اور میرا خیال
یہ ہے کہ قدیم نسخوں میں جہاں جہاں ”مظہر“ لکھا تھا اس سے
مقصود بھی مظاہر ہی تھا جیسا کہ ”اسماعیل“ کے بجائے ”اسمعیل“
اور ”اسحاق“ کے بجائے ”اسحق“ اور ”قاسم“ کے بجائے ”قسیم“ اور
”حارث“ کے بجائے ”حرث“ لکھنے کا رواج رہا ہے کہ کتابت میں
الف نہیں لکھا جاتا اور قرأت میں پڑھا جاتا ہے۔ (۱)

صاحب نسخ نے اپنا تاریخی اجتہاد اس کے خلاف
صرف کیا ہے لیکن ان کا مستند اس باب میں صرف رجز کا قافیہ
ہے ان کی رجز جو تاریخوں میں مذکور ہے یہ ہے:-

انا حبیب و ابی مظاہر
فارس ہیجاء و حرب تسعر
انتم اعد عدۃ و اکثر
ونحن اوفی منکم و اصبر

(۱) تنقیح المقال، ج ۱ ص ۲۵۳

(۱) تاریخ طبری، ج ۶ ص ۲۵۱ (۲) نسخ التواریخ، ج ۶ ص ۳۶۸

میں الف نہ ہو لیکن اس کے برعکس اگر قافیہ بلا تاسیس ہے اور صرف وہی اس میں بنیاد قافیہ ہے تو اس میں شاذ و نادر طریقہ پر ایسے الفاظ کا آجانا جن میں الف موجود ہے ممنوع نہیں ہے۔ اس صورت میں اس الف کا بصورت ”تاسیس“ لحاظ ہی نہیں کیا جاتا بلکہ صرف نظری پر رکھی جاتی ہے۔

مثلاً مظعم، عیلم، خضرم، وغیرہ کے قوافی میں ”عالم“ آجانا شعرائے عرب کے کلام میں معدوم النظر نہیں ہے۔ اس لئے شعرائے عرب کے کلام سے مثالیں پیش کرنے کے بجائے خود اسی نسخ کے باب المراثی میں سے بعض مثالیں پیش کر دینے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

ملاحظہ ہو سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کا مرثیہ جس کا مطلع یہ ہے:-

خلیلی من شہر المحرم غالنی
مصائب له عینای اسبلتا دما
یہاں الف موجود ہے لیکن اس کے بعد کا شعر ہے:-
و ذلت رقاب المسلمین لاجله
وہدی قوی الاسلام قصر و ہدما
اس کے بعد آخر تک کہیں الف نہیں ہے۔

شیخ ضعیفی کا مرثیہ جو مقتل عالم سے نقل کیا گیا ہے۔ اس کا مطلع ہے:-

لم ابك ربعا للاحبه قد خلا
وعفا وغیره الجدید والحلا
لیکن اسی قصیدہ میں یہ شعر ہے:-

تبکی علی تکدیر دھرما صفا
من بعدہ وقریر عیش ما حلا
نیز یہ شعر:-

ام انزلت ای بمنعی ارثہ
قد کان یخفیہا النبی اذا تلا
پھر یہ شعر:-

وفی فئۃ مثل البدو روکو املا
عرض المحاق بہا فاضحت افلا
شیخ محمود طریقی کا قصیدہ ہے جس کا مطلع یہ ہے:-
ہجرعی فتلذذی علی محرم
اذا هل فی دور الشہور محرم
اس قصیدہ میں یہ بھی ہے:-

ہم العروۃ الوثقی ہم معدن التقی
ہم الشرف السامی ونور الہدی ہم
نیز یہ شعر:-

اخی زود الولہی سکینۃ نظرة
فمہجتہا حرّی و عہدتہا دم
پھر اگر ”تسعر“ ”اصبر“ کے قوافی کے ساتھ ”مظاہر“ آجائے تو کون سا ارضی و سماوی انقلاب ہو جائے گا۔ کیا اتنے کمزور دلائل پر تاریخی نتائج کی بنیاد قائم ہو سکتی ہے اور ان شواہد کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے جو ”مظاہر“ کی صحت کو ثابت کر رہے ہیں۔
اوصاف و خصوصیات

حبیب ابن مظاہر، میثم تمار اور رشید ہجرئی کی طرح امیر المؤمنینؑ کے ان صحابہ بااختصاص میں سے تھے جنہیں امیر المؤمنینؑ سے خاص طور سے علوم باطنی اور اسرار کی تعلیم دی تھی جس کی بناء پر ان لوگوں نے آپس میں ایک دوسرے سے اس کے طریقہ شہادت کو پیشین گوئی کے طور سے بیان کیا اور اطلاع دی۔^(۱)

عام طور سے یہ مشہور ہے کہ حبیب بن مظاہر امام حسینؑ کے بچپن کے رفیق تھے لیکن اس کا کوئی تاریخی ثبوت اب تک پیش نظر نہیں ہے۔

بعض ارباب مقاتل نے جو امام حسینؑ کا خط ان کے نام نقل کیا ہے اس میں ان کے نام کے ساتھ ”الرجل الفقیہ“ کے

(۱) رجال کشی، ص ۵۲-۵۰

الفاظ ذکر کئے ہیں لیکن اس خط کی روایت کا بھی تاریخی اعتبار کوئی نہیں۔

بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حبیب بن مظاہر کی شخصیت اصحاب امام حسینؑ میں خاص امتیاز رکھتی تھی جس کے شواہد خود اسی کتاب میں ابھی سامنے آئیں گے، جیسے سب سے پہلے خط میں جو امام حسینؑ کے نام شیعہ اہل کوفہ کی طرف سے لکھا تھا ان کے نام کا سلیمان بن صدوغیرہ کے ناموں کے ساتھ خصوصیت سے مذکور ہونا، امام کا انہیں میسرہ کا افسر بنانا، میدان جنگ میں مبارز طلبی کے سلسلہ میں دشمن کی طرف سے ان کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جانا، ان کی شہادت سے امام حسینؑ کے چہرہ پر خاص طرح کی شکستگی کا طاری ہونا، یہ باتیں یقینی انہیں ایک بلند درجہ کا مالک ثابت کرتی ہیں جو عام اشخاص کو حاصل نہیں ہوا کرتا۔

کوفہ کا پہلا خط

سب سے پہلے جب معاویہ کے انتقال کی خبر کوفہ میں پہنچی اور امام حسینؑ کو کوفہ کی طرف بلانے کا خیال بعض دماغوں میں پیدا ہوا تو سلیمان بن صدوغیرہ کے مکان پر شیعہ اہل کوفہ کا اجتماع ہوا۔ اس موقع کی پوری تفصیل میں نے قاتلان حسینؑ کا مذہب میں لکھی ہے۔

اس جلسہ کی روداد سے ظاہر ہے کہ اس موقع پر حبیب بن مظاہر موجود تھے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اس جماعت میں نمایاں ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ جب یہ رائے قرار پائی کہ خط امام کے نام لکھا جائے تو حسب ذیل عبارت تحریر کی گئی۔

”بسم الله الرحمن الرحيم۔ الحسين بن علي من سليمان بن صدوق والسيب بن نجبة ورفاعة بن شداد وحبیب بن مظاهر و شيعة من البومنين ومسلمين من اهل الكوفة... الخ“

(یعنی) ”بنام حسینؑ بن علی از جانب سلیمان بن صدوق، مسیب بن نجبة، رفاعہ بن شداد و دیگر شیعہ اہل کوفہ و مسلمین از اہل کوفہ۔“

یہ خط عبداللہ بن سبیح ہمدانی اور عبداللہ بن دال کے ہاتھ بھیجا گیا اور امام کو دس (۱۰) ماہ رمضان کو مکہ معظمہ میں پہنچا۔^(۱)

یہ ظاہر ہے کہ تمام مجمع میں جو نمایاں، معزز اور ممتاز اشخاص تھے اور جنہیں امام حسینؑ کے ساتھ تعلقات خصوصی حاصل تھے انہیں کے نام صراحتہً مذکور ہوئے ہیں اور دوسرے افراد کو ”شیعة من البومنين و مسلمين“ کے تحت میں داخل کر دیا گیا ہے۔

چنانچہ مذکورہ بالا اسم اشخاص میں سے سلیمان بن صدوق خزاہی ہیں جو اختیار و افاضل میں سے صحابی رسول اور راوی احادیث تھے اور امیر المؤمنینؑ کے ساتھ جنگ صفین میں شریک ہو چکے تھے۔^(۲)

مسیب بن نجبة بھی صاحب ادراک ہیں۔ قادیسیہ اور فتوح عراق میں شرکت کی۔^(۳)

ابن عساکر نے ان کی صحابیت کا بھی اظہار کیا ہے۔^(۴) رفاعہ بن شداد بجلی اصحاب امیر المؤمنینؑ و امام حسنؑ میں تھے اور ان لوگوں میں سے ہیں کہ جنہوں نے ابوذر کے دفن میں شرکت کی تھی جن کے لئے پیغمبرؐ کی بشارت موجود تھی۔^(۵)

یقیناً ان لوگوں کے ساتھ حبیب ابن مظاہر کے نام کا صراحتہً درج ہونا اسی بنا پر ہو سکتا ہے کہ یہ بھی اسی پایہ کے مالک اور اسی مرتبہ کے حامل تھے اور عام جماعت شیعہ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔

(۱) طبری، ج ۶ ص ۱۹۷ (۲) اصابہ، ج ۲ ص ۶۷

(۳) اصابہ، ج ۳ ص ۲۹۵

(۴) اصابہ، ج ۳ ص ۲۸۹ (۵) تنقیح المقال، ج ۱ ص ۳۳۲

جلسہ میں تقریر

جب حضرت مسلم کوفہ میں وارد ہوئے اور مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے مکان میں فروکش ہوئے تو سب سے پہلا اجتماع شیعوں کا جو ہوا اس میں جناب مسلم نے امام حسین کا خط پڑھ کر سنایا۔ اس موقع پر سب سے پہلی تقریر عابس بن ابی شیبہ شاکری نے کی تھی جو ان کے حالات میں تمام وکمال درج کی جائے گی۔ خلاصہ اس کا یہ تھا کہ میں دوسرے اشخاص کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا اور آپ کو کسی دھوکے میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا مگر جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں ہر طرح امداد کے لئے آمادہ ہوں۔

اس تقریر کے ختم ہونے پر حبیب ابن مظاہر کھڑے ہوئے اور تائیدی حیثیت سے عابس کو شاباشی دی اور کہا کہ کتنے مختصر الفاظ میں تم نے حقیقت حال اور اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کر دیا ہے پھر جناب مسلم سے مخاطب ہو کر کہا:-

”وانا والله الذی لا اله الا هو علی مثل ما هذا علیہ۔“

”اور میں بھی قسم اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں اسی ارادہ پر قائم ہوں جو انہوں نے ظاہر کیا ہے۔“ (۱)

دشمن کو نصیحت

حبیب بن مظاہر برابر ایسے مواقع کے منتظر رہتے تھے جن میں وہ دشمن کے ساتھ گفت و شنید کر سکیں اور نصیحت کے فرض کو انجام دیں۔ چنانچہ جب عمر بن سعد نے قرۃ بن قیس حنظلی کو امام حسین کے پاس بصریہ مرسلت بھیجا ہے اور قرۃ بن قیس دور سے آتا دکھائی دیا، امام نے پوچھا: ”تم لوگ اس شخص سے واقف ہو؟“ حبیب بن مظاہر نے کہا: ”جی ہاں! یہ قبیلہ حنظلہ سے تسمی شخص ہے اور اپنے ننھیالی رشتہ سے ہمارا عزیز بھی ہوتا ہے۔ میں اسے کافی سمجھدار انسان سمجھتا تھا اور ہرگز یہ توقع

نہ تھی کہ اس جنگ میں یہ آکر شریک ہوگا۔“

وہ آیا اور امام کو ابن سعد کا پیغام پہنچایا جس کا حضرت نے مناسب جواب دے دیا۔ حبیب ابن مظاہر نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر کہا: ”ارے قرۃ بن قیس! کہاں جا رہے ہو ظالم جماعت کی طرف اس بزرگ کی امداد کرو جس کے بزرگوں کی بدولت خدا نے تم کو اور ہم کو اسلام کی عزت عطا کی۔“

قرہ نے کہا: ”میں جواب پیغام کا جا کر کہہ دوں۔ اس کے بعد اس مسئلہ پر غور کروں گا۔“ (۱)

اس تقریر کا اثر قرۃ کے دل پر ہوا ضرور۔ چنانچہ اس موقع پر جب حر بن یزید ریاحی فوج دشمن سے کنارہ کشی کر کے امام کے لشکر کی طرف آنا چاہتا تھا قرہ بن قیس اس کے ساتھ تھا۔ حر نے قرہ کو پاس سے ہٹانے کے لئے کہا: ”تم نے اپنے گھوڑے کو پانی نہیں پلایا؟“ قرہ نے کہا ابھی جاتا ہوں پانی پلائے لیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ہٹ گیا اور حر اپنی جگہ سے آگے بڑھ کر فوج حسینی کی طرف پہنچ گئے قرۃ کو اس کا بڑا غم رہا کہ حر نے اپنا پورا ارادہ مجھ سے ظاہر نہ کیا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر حر مجھ سے اپنا پورا قصد ظاہر کر دیتے تو میں بھی ان کے ساتھ نصرت حسین کے لئے چلا جاتا۔ (۲)

اس تاسف اور اظہار رنج سے صاف ظاہر ہے کہ دل تو اس کا اس احساس سے معمور ہو چکا تھا اور ضمیر اس کا آمادہ کر رہا تھا مگر اس میں قوت ارادی اتنی نہ تھی کہ وہ حر کی طرح اس خیال کو عملی جامہ پہنا سکے وہ اس کے لئے سہارے کا محتاج تھا اور اس کی عملی کمزوری تھی جس نے سہارا نہ ہونے سے اس کے قدم سعی کو روک لیا۔

فوج مخالف سے گفتگو

نویں تاریخ کی شام کو جب اہل کوفہ نے دفعۃً امام کی طرف کارخ کیا اور حملہ کر دیا اور امام نے جناب عباسؓ کو ان

آپ کیا کہتے ہیں۔ اس گستاخی کا حبیب بن مظاہر نے جواب دیا:

”واللہ انی لا راک تعبد اللہ علی سبعین حرفاً وانا اشہد انک صادق ما تدری ما یقول، قد طبع اللہ علی قلبک۔“

بیشک خدا کی قسم میں سمجھتا ہوں کہ تو خدا کی ستر حرفوں پر عبادت کرتا ہے (یعنی تیری عبادت، مخلصانہ حیثیت سے یک رنگ نہیں بلکہ ہفتاد رنگ ہے) اور میں اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ تو سچ کہتا ہے۔ تیری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ امامؑ کیا فرماتے ہیں کیونکہ تیرے دل پر مہر لگ چکی ہے۔^(۱)

بنی اسد سے امداد

حبیب ابن مظاہر نے شب عاشور امام حسین علیہ السلام سے اجازت چاہی کہ وہ جا کر اپنے قبیلہ بنی اسد سے جو اطراف میں مقیم ہیں۔ آپ کی امداد کی خواہش کریں۔ امامؑ نے اجازت دی اور حبیب گئے۔ بنی اسد کے مجمع میں جا کر ان کو وعظ و نصیحت کی اور انھیں نصرت امام پر ترغیب دلائی جس پر سب سے پہلے عبداللہ بن بشیر اسدی نے لبیک کہی اور پھر دوسرے لوگ بھی آمادہ ہوئے اور یہ سب حبیب کے ساتھ روانہ ہوئے مگر اس کی خبر عمر سعد کو ہو گئی اور اس نے پانچ سو ۵۰۰ سوار سد راہ ہونے کے لئے بھیج دیئے جن کے مقابلہ کی اس جماعت کو تاب نہ ہوئی اور سب لوگ واپس چلے گئے۔ حبیب تنہا خدمت امام میں واپس پہنچ گئے۔^(۲)

سرداری کا منصب

روز عاشور جب امامؑ نے اپنی مختصر فوج کو ترتیب دیا تو اس موقع پر زہیر بن قینؑ کو میمنہ کا افسر اور حبیب بن مظاہرؑ کو میسرہ کا سردار مقرر کیا تھا۔^(۳)

(۱) طبری، ج ۶ ص ۲۴۳ (۲) البصار العین، ص ۵۸-۵۷

(۳) طبری، ج ۶ ص ۲۴۰

کے پاس مکالمہ کے لئے بھیجا۔ جناب عباسؑ بیس سواروں کے ساتھ جن میں زہیر بن قینؑ اور حبیب بن مظاہرؑ بھی تھے ان کے سامنے گئے اور دریافت کیا کہ تمہارا کیا مطلب ہے۔ جواب ملا کہ ابن زیاد کا حکم آگیا ہے کہ یا تم سے بیعت لی جائے اور یا جنگ کی جائے۔ جناب عباسؑ یہ کہہ کر کہ میں امام سے دریافت کر لوں تو آکر جواب دوں۔ امامؑ کی خدمت میں واپس آگئے، دوسرے اصحاب سب وہیں کھڑے رہے۔ اتنے وقت کو حبیب نے بیکار جانے نہیں دیا۔ زہیر بن قینؑ سے کہا کہ ان لوگوں سے کچھ گفتگو کرو، اگر چاہو اور کہو تو میں کچھ بات چیت کروں۔ زہیرؑ نے کہا کہ آپ نے اس کی تحریک کی ہے تو آپ ہی گفتگو بھی کیجئے۔ حبیبؑ نے مجمع کو مخاطب کر کے کہا:-

”سوچو تو! کتنا برا انجام ہوگا خدا کے یہاں اس جماعت کا جو اس کے سامنے جائے گی اس حالت میں کہ اس نے اولاد رسولؐ کا خون بہایا ہے اور ملک کے ان عبادت گزاروں کو قتل کیا ہے جو پچھلے پہر سے اٹھنے والے اور کثرت سے ذکر الہی کرنے والے ہیں۔“

عزہ بن قیس نے جو ایک خفیف الحركات مسخرہ انسان تھا بات کو کاٹنے کے لئے پکار کر کہا کہ حبیبؑ تم اپنی طرف ہر موقع پر اشارہ کرتے رہتے ہو کہ میں بڑا عبادت گزار ہوں۔ یہ بے موقع گستاخی سن کر زہیر کو غصہ آگیا اور کہا: ”عزہ اس میں رشک کا ہے؟ بیشک حبیبؑ کا نفس ایسا ہے جس کا خدا نے تزکیہ کیا ہے اور اس کو صحیح راستہ پر چلنے کی توفیق عطا کی ہے۔“^(۱)

شمر کی گستاخی کا جواب

جب امام حسینؑ نے صبح روز عاشور اپنا تاریخی یادگار خطبہ پڑھا ہے شمر نے انتہائی بے شرمی، بے حیائی اور مکینہ فطرتی سے پکار کر آواز دی کہ میں منافق ہوں اور خدا کی عبادت ایک حرف پر کرتا ہوں (یعنی صرف زبانی) اگر کچھ میری سمجھ میں آ رہا ہو کہ

(۱) طبری، ج ۶ ص ۲۳۷

وصیت کرو تا کہ میں اس وصیت کو پورا کروں اور جو تمہاری قرابت اور مذہبی خصوصیت کا حق ہے اس کو ادا کروں۔ مسلمؐ نے کہا: ”اور کچھ نہیں یہی وصیت ہے کہ ان کی نصرت سے ہاتھ نہ اٹھانا“ اور اشارہ کیا امام حسینؑ کی طرف۔ حبیبؑ نے کہا: ”ضرور ایسا ہی ہوگا، خدا کی قسم۔“^(۱)

نماز ظہر کا ہنگام اور حصین کی جسارت

جب ظہر کا وقت آیا اور امامؑ نے اپنے اصحاب سمیت نماز پڑھنے کا ارادہ کیا اور فرمایا فوج مخالف سے نماز پڑھنے کی مہلت لی جائے تو حصین بن تمیم نے جو عمر سعد کی فوج کا ایک افسر تھا پکار کر آواز دی کہ نماز پڑھنا ہو تو پڑھ لو مگر وہ قبول نہیں ہے۔

بس یہ سننا تھا کہ حبیبؑ کو تاب نہ رہی۔ پکار کر کہا کہ ”قبول نہیں ہے؟“ فرزند رسولؐ کی نماز تیرے خیال میں قبول نہ ہوگی اور تیری نماز قبول ہوگی اے شرا بخوار“

حصین نے یہ سن کر حملہ کر دیا اور حبیبؑ بھی مقابلہ پر آگئے۔ اس کے گھوڑے کے منہ پر تلوار لگائی جس سے وہ الف ہو گیا اور حصین گر کر زمین پر آ گیا۔ دوسرے ساتھیوں نے بڑھ کر حلقہ میں لے لیا اور حبیبؑ کے ہاتھ سے چھڑا کر لے گئے۔

جنگ اور شہادت

اب حبیب میدان جنگ میں آ ہی چکے تھے۔ ایمان کا جوش اور شجاعت کی امگ، دشمن کی جرأت و جسارت کا غصہ اور اس کے زندہ نکل جانے کا دوسرا غم و غصہ وہ یہ شعر پڑھنے لگے:-

اقسم لو کنا لکم اعدادا
او شطر کم ولیتم اکتادا
یا شر قوم حسبوا وادا
(یعنی) ”میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہم اگر تعداد میں تمہارے برابر ہوتے یا تمہارے آدھے بھی ہوتے تو تم

(۱) طبری، ج ۶ ص ۲۴۹

ظاہری نگاہ میں اس سے زہیر بن قینؑ کی فضیلت زیادہ ظاہر ہوتی ہے مگر بعض ارباب نظر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ میسرہ کا مقابلہ دشمن کے میمنہ سے ہوتا ہے اس لئے وہاں زیادہ قابل اعتبار اور طاقتور انسان کی ضرورت ہے۔

سبقت الی الجہاد پر آمادگی

جنگ چھڑنے کے بعد سب سے پہلے جو دو پہلوان دشمن کی طرف سے نکلے ہیں، وہ یسار اور سالم دو غلام تھے۔ انہوں نے مبارز طلبی کی ہے حبیب بن مظاہرؑ اور بریر خضیر ہمدانیؑ یہی دو جوان ہمت مشتاق شہادت تھے جو جست کر کے کھڑے ہو گئے تھے مگر امامؑ نے ان کو منع کر دیا تھا جس کے بعد عبداللہ بن عمیر کلبی اٹھ کھڑے ہو گئے اور جا کر ان دونوں کا مقابلہ کیا۔ فوج حسینی میں حبیبؑ اور زہیر اور بریر یہ چند ایسے مجاہد تھے جن کی دشمن کی فوج میں خاص شہرت تھی چنانچہ جب عبداللہ بن عمیر مقابلہ پر نکلے اور ان دونوں پہلوانوں نے نام و نسب پوچھا اور معلوم ہوا تو انہوں نے کہا کہ ہم تم سے واقف نہیں ہیں۔ ہمارے مقابلہ پر زہیر بن قینؑ یا حبیب بن مظاہرؑ یا بریر بن خضیرؑ کو آنا چاہئے جس پر عبداللہ کو غصہ آ گیا اور انہوں نے حملہ کر دیا۔^(۱)

مسلم بن عوسجہؑ سے گفتگو

مسلمؑ اور حبیبؑ دونوں ہی قبیلہ بنی اسد کے تھے ممکن ہے آپس میں اس کے علاوہ کچھ قرابت بھی ہو اور سن بھی دونوں مجاہدوں کا قریب ہی قریب تھا۔

جیسا کہ مسلم بن عوسجہؑ کے حالات میں لکھا جا چکا جب وہ مجروح ہو کر گرے اور امامؑ ان کے سر ہانے تشریف لے گئے تو حبیبؑ بھی حضرت کے ساتھ ساتھ تھے حبیبؑ نے مسلمؑ کو مبارکباد دی اور اس کے بعد یہ کہا کہ اگر مجھے یہ نہ معلوم ہوتا کہ میں بھی تمہارے بعد آ کر تم سے ملتا ہوں تو میں کہتا کہ

(۱) طبری، ج ۶ ص ۲۴۵

ہمارے سامنے سے یقینی بھاگ جاتے۔ اے بدترین خلق قوم حسب و نسب اور اخلاق کے لحاظ سے۔“
پھر انہوں نے یہ جڑ پڑھی:-

انا حبیب و ابی مظاهر
فارس ہیجاء و حرب تسعر
انتم اعدا وعدة و اکثر
و نحن اوفی منکم و اصبر
و نحن اعلی حجة و اظہر
حقاً و اتقٰی منکم و اعذر

(یعنی) ”میں حبیب ہوں اور میرے باپ کا نام مظاہر تھا۔ میدان جنگ اور بھڑکتی ہوئی لڑائی کے ہنگام کا شہسوار ہوں۔ تمہاری تعداد ہم سے زیادہ اور لڑائی کا سامان تمہارے پاس فراواں ہے مگر ہم اپنی بات کے زیادہ دھنی اور مشکلات کے زیادہ برداشت کر نیوالے ہیں۔ نیر حجت ہماری بالا اور حقیقت نمایاں اور فرائض کی پابندی زیادہ اور دامن صاف ہے۔“

آخری باتیں جو ذکر ہوئی ہیں تمام وہ ہیں کہ دل میں طاقت اور نفس میں اطمینان پیدا کرتی ہیں جن کے بعد انسان خطرات کو کوئی چیز نہیں سمجھتا۔ حبیب نے سخت جنگ کی یہاں تک کہ ایک تہمی پہلوان نے، جس کا نام تھا بدیل بن صریم، حبیب پر حملہ کیا حبیب نے فوراً ایک ضرب شمشیر میں اس کا کام تمام کیا لیکن اسی کے ساتھ بنی تمیم کے ایک دوسرے شخص نے ان پر نیزہ کا وار کر دیا جس سے وہ زمین پر آ رہے۔ ابھی وہ اٹھنا چاہتے تھے کہ ان کے پہلے کے شکست خوردہ حریف حصین بن تمیم نے ان کے سر پر تلوار لگائی جس سے وہ بیجان ہو کر گر گئے۔ تہمی شخص جس کے نیزہ نے حبیب کو گرایا تھا سر کاٹنے کے لئے قریب آیا۔ حصین نے کہا: ”میں ان کے قتل میں شریک ہوں۔“ تہمی نے کہا: ”نہیں، کام میں نے کیا

ہے۔“ آخر حصین نے کہا کہ مجھے اتنا کر لینے دو کہ میں ان کا سر اپنے گھوڑے کی گردن میں باندھ کر ایک دفعہ لشکر میں گردش کر لوں تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ میں نے ان کے قتل میں شرکت کی پھر تم اس سر کو لے لینا اور ابن زیاد کے پاس لے جانا وہاں سے جو انعام ملے اس میں حصہ نہیں لوں گا۔“ تہمی نے انکار کیا مگر لوگوں کے کہنے سے راضی ہو گیا اور حصین نے ایک مرتبہ سر کو اپنے ساتھ لے کر فوج کے اندر گردش کر لی۔ اس طرح گویا اس نے اس شکست کی خفت کو مٹا دیا جو اسے حبیب کے مقابلہ میں حاصل ہوئی تھی۔^(۱)

امام پیر اثر

تاریخ کی روایت ہے کہ جب حبیب بن مظاہر قتل ہوئے تو امام حسینؑ پر شکستگی کے آثار نمودار ہو گئے اور آپ کی زبان پر کلمات حسرت و یاس جاری ہوئے۔^(۲)

نوعمر فرزند کا جذبہ محبت

قرارداد کے مطابق حصین بن تمیم سے اس دوسرے شخص نے حبیب کا سر لے لیا اور کوفہ لے گیا پھر اپنے گھوڑے کی گردن میں آویزاں کر کے ابن زیاد کے قصر دارالامارہ کی طرف چلا۔ حبیب کا ایک نوعمر فرزند ”قاسم بن حبیب“ جو ابھی پورے طور پر بالغ نہ ہوا تھا اس نے جو اپنے باپ کے سر کو دیکھا تو ایک عجیب جذبہ بے قرار کے ساتھ اس سوار کے پیچھے ہولیا۔ جدھر جدھر وہ جاتا یہ بھی اس کے ساتھ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے احساس پیدا ہوا، اس نے کہا ”صاحبزادے! تم میرے ساتھ کیوں پھر رہے ہو۔“ قاسم نے بتلایا کہ یہ میرے باپ کا سر ہے، کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تم مجھے اسے دے دو کہ میں دفن کر دوں؟“ اس نے کہا ”امیر اس پر راضی نہیں ہوگا اور مجھے اس پر انعام حاصل کرنا ہے۔“ یہ سن کر وہ بچہ مایوس ہوا اور رونے لگا اور اسے چھوڑ کر چلا گیا۔

(۱) طبری، ج ۶ ص ۲۵۲-۲۵۱ (۲) طبری، ج ۶ ص ۲۵۲

اور پھر ایک دوسرے تمیمی شخص نے انھیں نیزہ لگایا۔ دوسرے روایت میں اس کا پتہ بھی نہیں ہے کہ وہ اس سر کو لے کر مکہ گیا جس پر صاحب 'ناسخ' نے یہ پوری عمارت کھڑی کر دی ہے۔ تیسرے روایت میں اس جزو کا بھی نشان نہیں۔ کہ فرزند حبیب نے وہ سر لے کر اسے دفن کر دیا اور قاتل کو اسی وقت مار ڈالا۔

یہ ہے صاحب 'ناسخ' کی تحقیقی و تاریخی شان جس سے دنیا اب تک بے خبر رہی ہے۔

(۶۴) حر بن یزید ریاچی

نام و نسب

حر بن یزید بن ناجیہ بن ثعلبہ بن عتاب بن ہرمی بن رباح بن یربوع بن حنظلہ بن مالک بن زید مناة بن تمیم النخعی الی ربوعی الریاحی۔^(۱)

طبری میں ایک جگہ "الحمر بن یزید الحنظلی ثم العنہشلی" لکھا ہے۔^(۲)

حنظلی لکھنے کی وجہ مذکورہ بالا سلسلہ نسب سے ظاہر ہے کیونکہ "یربوع" کے پہلے "حنظلہ بن مالک" کا نام سلسلہ اجداد میں موجود ہے لیکن "عنہشلی" لکھنے کی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ ممکن ہے اس سلسلہ میں حنظلہ کے بعد کہیں پر "نہشل" کا واسطہ ہو جو درمیان سے ساقط ہو گیا ہے۔

خاندانی خصوصیت

حر کا خاندان عرب میں قدیمی عزت کا مالک تھا۔ عتاب جو حر کی چوتھی پشت میں ہے نعمان بن منذر ملک حیرہ کے مخصوصین میں وہ درجہ رکھتا تھا کہ گھوڑے پر اس کے "ردیف" کی صورت سے سوار ہوتا تھا۔

عتاب کے دو فرزند تھے قیس اور ثعلب۔ باپ کے انتقال کے بعد یہ منصب قیس کو حاصل ہوا۔ بنی شیبان نے اس

(۱) البصار لعین، ص ۱۱۵ (۲) تاریخ طبری، ج ۶ ص ۲۲۲

اس دن کی گھڑی اور پھر کئی برس کی مدت۔ وہ بات اس بچے کے دل میں بیٹھ گئی اور جب وہ جوان ہوا تو اس فکر میں رہنے لگا کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو کسی طرح قتل کر ڈالوں یہاں تک کہ جب مصعب بن زبیر کا زمانہ ہوا اور مصعب نے "باجیرا" میں جا کر عبدالملک بن مروان سے لڑائی کے سلسلہ میں چھاؤنی اپنی قرار دی تو حبیب کا فرزند مصعب کی فوج میں ملازم ہو گیا۔ اس نے یہاں اپنے باپ کے قاتل کو بھی دیکھا اور اس کے درپے ہوا کہ میں موقع پا کر اسے قتل کروں یہاں تک کہ ایک روز دوپہر کے وقت وہ اپنے خیمہ میں سو رہا تھا قاسم نے جا کر اپنی تلوار سے اس کا کام تمام کر دیا۔^(۱)

صاحب ناسخ نے اس واقعہ میں جس تاریخی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے وہ ملاحظہ ہو۔

"گفتہ اند بدیل بن صریم سر حبیب را برید و از گردن اسپ آویخت و بر نشست و بمکہ رفت و در مکہ پسر حبیب کہ بنوز کود کے مرا حق بود سر پدر را بشناخت بدیل را بکشت و سر پدر را ماخوذ داشتہ مدفون ساخت۔

و این سخن در نزد من بندہ استولد نمی افتد چہ در مکہ کسی نبود کہ بدیل بن صریم را بدین کردار عطا می کند و جائزہ دہد۔ عبد اللہ بن زبیر بن العوام کہ این ہنگام دعوی دار خلافت بود با حبیب کینی و کیدی نداشت کہ بدیل این مسافت دراز را پیماید و ہمہ جاسر حبیب علاقہ گردن اسپ او باشد اگر بطمع عطا بود البتہ بکوفہ می شافت اللہ عالم۔"^(۲)

اب ملاحظہ کیجئے اوّل تو قاتل حبیب کا نام بدیل بن صریم نہیں ہے بلکہ بدیل بن صریم وہ تھا جسے حبیب نے قتل کیا

(۱) طبری، ج ۶ ص ۲۵۲ (۲) ناسخ التواریخ، ج ۶ ص ۲۶۸

کرایا، اس کی تفصیل بھی میں نے اپنی اور کتابوں میں لکھی ہے۔^(۱)

فرزند رسولؐ کے اس ایثار، کرم، حسن اخلاق، بلند حوصلگی اور انسانی ہمدردی کا سب سے پہلا اثر تھا جو حر کے دل پر قائم ہوا۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اس سے امام کے مقابلہ میں کسی مخالف طرز عمل کا اختیار کرنا بتا ہی نہ تھا۔ یہاں تک کہ جب نماز ظہر کے وقت امام نے حر کی فوج کے سامنے تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ نے اہل کوفہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں تمہارے خطوط کی بنا پر تمہارا بلا یا ہوا آیا ہوں، اگر تم اس بات پر باقی ہو تو خیر نہیں تو جہاں سے آیا ہوں وہاں واپس چلا جاؤں۔“ تو اس تقریر کا بھی حر کی جانب سے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ بالکل خاموش تھا اور اسے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔

نماز جماعت

جب نماز کی اقامت ہوئی تو اس وقت امام نے حر سے فرمایا کہ تم اپنے ساتھیوں کو علیحدہ نماز پڑھاؤ گے؟ حر نے عرض کیا: ”نہیں، بلکہ آپ نماز پڑھائیے اور ہم سب آپ ہی کی اقتداء میں نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور دونوں طرف کے لشکروں نے امام کے پیچھے نماز ادا کی۔

اس سے نتیجہ تو نکالا نہیں جاسکتا کہ حر یا اس کے ساتھی مذہبی حیثیت سے شیعہ تھے جبکہ عام اسلامی نقطہ نظر سے امامت جماعت کے لئے امام یعنی جانشین رسولؐ ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ اکثریت کے نزدیک عدالت تک بھی معتبر نہیں ہے بلکہ صرف مسلمان ہونا کافی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ غیر شیعہ مسلمان بھی حسینؑ بن علیؑ کو ایک فرد مسلم سمجھنے پر تو مجبور ہی ہیں۔ پھر آپ کی اقتداء میں نماز پڑھنے سے یہ کیوں کر ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ شیعہ تھے، مگر پھر بھی یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں امام حسینؑ کی نسبت کوئی خاص جذبہ عداوت و

سے منازعت کی جس کے نتیجہ میں ”یوم الطفہ“ کی خونریز جنگ واقع ہوئی۔ قیس کے سلسلہ میں انھوں نے شاعر ایک صحابی تھے جن کا نسب ہے ”زید بن عمر بن قیس بن عتاب“ طبقہ کے لحاظ سے وہ حر کے باپ یزید کے چچا زاد بھائی اور حر کے رشتہ کے چچا ہوتے ہیں۔

ذاتی عزت

حر کوفہ کے رؤسا میں سے تھا۔ اور ابن زیاد کی فوج میں افسر کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب امام حسینؑ مکہ سے کوفہ کے قصد سے روانہ ہوئے ہیں اور ابن زیاد کی جانب سے جو کوفہ کا حاکم تھا حدود کی ناکہ بندی ہوئی ہے۔ جس کا تذکرہ میں نے اپنی متعدد کتابوں میں کیا ہے۔^(۱) الحسین بن تمیم کوئی ہزار سواروں کے ساتھ قادیسیہ میں مقرر کیا گیا تھا۔

حر بھی اس لشکر میں تھا اور وہیں سے ایک ہزار سواروں کا سردار ہو کر امام حسینؑ کے سدراہ ہونے کے لئے آگے بڑھا تھا۔

امام سے پہلی ملاقات

امام حسینؑ اپنے منازل سفر میں شراف سے آگے بڑھے ہیں، پہلی محرم ۶۱ھ دوپہر کا وقت ہے اس وقت سامنے سے لشکر آتے ہوئے نظر آیا۔ میں نے ”مجاہدہ کر بلا“ میں اس کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ امام نے فوج کو آتے دیکھ کر ذو حشم پہاڑ کا جو آپ کے بائیں طرف تھا رخ کیا تاکہ اسے پس پشت قرار دے کر دشمنوں سے سامنے کی جانب سے مقابلہ کریں۔ آنے والی فوج نے بھی اسی طرف کا رخ کر دیا مگر حضرت اس مقام تک پہلے پہنچ گئے تھے۔ آپ کے خیمے نصب ہو چکے تھے اس وقت وہ لشکر پہنچا۔ یہ حر ہی تھا جو اپنے رسالے کے ساتھ آیا تھا۔ فوج پر پیاس کا غلبہ تھا۔

امام نے سب سے پہلے پورے لشکر کو پانی سے سیراب

(۱) قتالان حسین کا مذہب، طبع چہارم، ص ۹۵ / مجاہدہ کر بلا، ص ۵۱ / اسوۂ

سامنے ہوگی۔“

مخالفتانہ اقدام اور ادب شناسی

حڑ کے لئے بڑا نازک مرحلہ تھا اس لئے کہ اس کا ضمیر بالکل مردہ نہ تھا۔ اسے ایک طرف فرض منصبی کا خیال اور دوسری طرف حسین بن علیؑ کی شخصیت کا احساس۔ مگر موقع سخت سے سخت ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے پہلے صرف الفاظ کی ضرورت تھی اور اب عمل۔ کیونکہ امام نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ اپنی سوار یوں پر سوار ہو جاؤ۔ چنانچہ سب لوگ یہاں تک کہ مخدرات بھی اپنی عمار یوں پر سوار ہو گئے۔ حضرت نے اصحاب سے فرمایا کہ چلو جس راستہ سے آئے ہیں اسی راستے پر چلو۔ اب حڑ کو کیا کرنا چاہئے۔ وہی جو اس کو حکم دیا گیا ہے، حرکی فوج سامنے آ کر سد راہ ہو گئی اور اس طرف جانے سے مزاحمت کی۔

حسامنے تھا۔ امام نے غصہ سے فرمایا:

”ثكلتك امك ماترید۔“

”ماں تیری تیرے ماتم میں بیٹھے، کیا ارادہ رکھتا ہے؟“

حڑ ایک شریف قوم و قبیلہ کا انسان تھا اور دنیاوی عزت رکھتا تھا۔ اس کے لئے اس فقرہ نے تازیانہ کا کام کیا۔ مگر پھر بھی وہ حسینؑ کے مقابلہ میں اپنے نفس کو ”چھوٹا“ پارہا تھا۔ اس لئے اس نے ایک عجیب انداز سے اس فقرہ پر احتجاج کیا۔ وہ کہتا ہے:-

”خدا کی قسم اگر کوئی اور قوم عرب میں سے مجھے یوں کہتا اس حالت میں کہ جس حالت میں آپ ہیں تو میں بھی ضرور اس کی ماں کا اسی طرح ذکر کرتا وہ کوئی بھی ہوتا مگر بخدا آپ کی والدہ ماجدہ وہ ہیں کہ جن کا ذکر بغیر انتہائی ممکن عزت و احترام کے میں کر ہی نہیں سکتا۔“

امامؑ نے فوراً اندازہ کر لیا کہ اس کا دل میرے مقابلہ میں جھکا ہوا ہے۔ آپ نے طرز کلام میں تبدیلی فرمائی اور کہا: ”پھر تم چاہتے کیا ہو؟“ حڑ نے کہا: ”خدا کی قسم میں چاہتا ہوں

نفرت نہیں تھا بلکہ کسی نہ کسی حد تک آپ کے عظمت و بزرگی کے احساس سے متاثر تھا جب ہی وہ خود آپ کے مقابلہ میں علیحدہ نماز جماعت قائم کرنے کو ایک غیر موزوں اور بے محل بات اور ایک طرح کی بے ادبی سمجھا۔

امامؑ کی دوسری تقریر اور حڑ کا جواب

نماز کے بعد امامؑ اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے اور حڑ اپنے خیمہ میں۔ پھر عصر کے بعد امام نے اپنے اصحاب کو روانگی کے لئے تیار ہونے کا حکم دیا اور عصر کی نماز پڑھائی جس کے بعد آپ نے فوج حڑ کے سامنے دوسری تقریر کی جس میں دوبارہ خطوط کا تذکرہ کیا اور اسی بات کو دوہرایا کہ اگر تم اپنے خطوط کے مضمون پر قائم نہ ہو تو میں واپس چلا جاؤں۔

حڑ اس کے پہلے امامؑ کے اخلاقی اثر سے خاموش تھا مگر اسے اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے کا خیال تھا۔ وہ ابن زیاد کا نوکر تھا اور خاص طور پر حسینؑ کو روکنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ وقت اب وہ آگیا تھا کہ حسینؑ روانگی کے لئے آمادہ ہو چکے ہیں اور اب اگر حر خاموشی کی پالیسی پر قائم رہا تو اس کا مقصد بالکل فوت ہوتا ہے۔ اس لئے اب اپنے دل کو سخت کر کے وہ بولا اور اس نے کہا:- ”ہمیں نہیں معلوم یہ خط کیسے ہیں جن کا آپ حوالہ دیتے ہیں۔“

حضرت نے وہ تمام خطوط منگوا کر سامنے پھیلا دیئے۔ حڑ نے کہا: ”ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنہوں نے یہ خط بھیجے تھے۔ ہمیں یہ حکم ہوا ہے کہ جہاں آپ مل جائیں پھر ہم آپ سے جدا نہ ہوں۔ یہاں تک کہ آپ کو ابن زیاد کے سامنے لے جائیں۔“

بس حرا ب امام کے سامنے ایک مخالف کی صورت سے تھا۔ امام نے فرمایا:-

”الموت ادنی الیک من ذلک۔“

”یہ بھلا کہاں ممکن ہے۔ اس سے پہلے موت تیرے

”میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں آپ اپنی زندگی پر رحم کیجئے اگر آپ نے بڑھ کر جنگ کی تو یقیناً قتل کئے جائیں گے اور اگر دشمن نے بڑھ کر آپ پر حملہ کیا تب بھی میری رائے میں آپ ہلاک ہوں گے۔“

الفاظ میں یقیناً ہمدردی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے اس کا دل حسینؑ پر کڑھ رہا ہے۔ مگر اس کا نفس اس بلندی پر نہیں ہے کہ وہ حسینؑ کے اس اقدام کے آخری نتائج تک پہنچ سکے۔ اس کو حسینؑ کی نفس کی پوری عظمت کا اندازہ بھی نہیں ہے جو دنیا کی زندگی کو اپنے سامنے ہیچ قرار دیتی ہے۔ پھر وہ ایک فوج مخالف کی فرد ہونے کے ساتھ یہ کہہ رہا ہے جس میں ایک تہدید کا پہلو بھی مضمر معلوم ہوتا ہے جس کو حسینؑ کی بلند ہمتی برداشت نہیں کر سکتی۔ حسینؑ نے اس کو اپنے مقصد کی گہرائیوں پر ایک عمیق ابہام کے پردہ میں مطلع کر دیا یہ فرما کر کہ:-

”افبالموت تخوفنی وهل يعد وبکم الخطب ان تقتلونی۔“

”کیا تو مجھے موت سے ڈراتا ہے۔ اور کیا تم اس سے زیادہ کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر دو۔“

یہ بظاہر عجیب چیز ہے۔ انسانی نگاہ میں آخری زیادہ سے زیادہ انجام قتل ہی ہے۔ لیکن حسینؑ اس کو ایک درمیانی منزل قرار دے کر کسی اس کے بعد کے درجہ کو فتح و شکست کا معیار قرار دے رہے ہیں۔

حزب سمجھا یا نہیں سمجھا مگر وہ اتنا سمجھ لیا کہ میری نصیحت کا کچھ اچھا اثر نہیں ہوا۔ اس لئے اس نے اب حسینؑ کے ساتھ ساتھ چلنا بھی مناسب نہیں سمجھا اور وہ حضرت سے تھوڑے فاصلہ پر علیحدہ ہو گیا اور دور، دور روانہ ہوا مگر آپ سے جدا نہیں ہوا۔

ایک اور واقعہ

جب امامؑ ”عذیب الجانات“ میں پہنچے تو چار آدمی اہل

کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس لے جاؤں۔“ حضرت نے فرمایا۔ ”میں تمہارا کہنا ہرگز نہیں مانوں گا۔“ اس نے کہا: ”میں آپ کو چھوڑوں گا ہرگز نہیں۔“ تین مرتبہ رد و بدل ہوئی۔ آخر میں پھر حر کے نفس نے شکست کھائی اور اس نے کہا: ”میں آپ سے جنگ کرنے پر مامور نہیں ہوں۔ مجھے تو یہ حکم تھا کہ آپ کے ساتھ ساتھ رہوں یہاں تک کہ آپ کو فہ پہنچیں۔ جب آپ کو فہ جانے سے انکار کرتے ہیں تو ایک ایسا راستہ اختیار کیجئے جو نہ کو فہ کی طرف جاتا ہو اور نہ مدینہ کی طرف واپسی کا راستہ ہو۔ اس کے بعد میں ابن زیاد کو لکھوں۔ اور آپ بھی چاہیں تو یزید یا ابن زیاد کو خط لکھیں۔ شاید خدا اس طرح سے ایسی صورت پیدا کر دے کہ مجھے آپ سے کوئی عملی مخالفت نہ کرنا پڑے۔“

دیکھا آپ نے حر کی نیت کا پردہ چاک ہو گیا۔ معلوم ہو رہا ہے کہ اس کا دل ڈانوا ڈول ہے۔ اسے یہ فکر ہے کہ میں اس بلند ہستی سے عملی مخالفت کس طرح کروں گا۔ وہ پہلو ڈھونڈ رہا ہے کہ کسی طرح اسے آپ کے ساتھ تصادم نہ کرنا پڑے اور عملی مخالفت کی نوبت نہ آئے۔

اسے اس کی بھی آرزو ہے کہ کسی طرح معاملات روبا صلاح ہو جائیں اور اس لئے وہ یہ مشورہ بھی دینا چاہتا ہے کہ آپ یزید یا ابن زیاد کو خط لکھئے۔ مگر ابھی اس کے نفس میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اپنی ملازمت کے خیال کو بالکل دل سے نکال دے اور دنیاوی زندگی کو اپنی بخیال خود فنا کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

راستہ کی گفتگو

جب امامؑ اس راستہ پر روانہ ہوئے جو آخر میں حر نے معین کیا تھا تو راستہ میں حر کہنے لگا:

”اِنِّی اِذْ کَرْتُ اللّٰهَ فِیْ نَفْسِکَ فَاِنِّیْ اَشْهَدُ لَئِنْ قَاتَلْتَ لِتَقْلَنْ وَلَئِنْ قَوَّلتَ لِتَهْلُکَنْ فِیْمَا اَرٰی۔“

کوفہ میں سے غیر معروف راستہ سے امامؑ کی نصرت کے لئے آئے: عمر بن خالد صیداوی، ان کا غلام سعد اور تین اور آدمی تھے۔^(۱)

حرامؑ کی نقل و حرکت کا نگران تھا، اس نے مداخلت کی اور کہا کہ یہ لوگ آپ کے ساتھ نہیں آئے ہیں، اس لئے یا تو میں انہیں گرفتار کر کے قید کر لوں گا یا کوفہ واپس کروں گا۔ حضرت نے فرمایا: اب جب کہ یہ میرے پاس پہنچ گئے اور میری امان میں آگئے تو میں انہیں تمہارے سپرد نہیں کر سکتا اور تم نے اقرار کیا تھا کہ جب تک ابن زیاد کا خط تمہارے پاس نہ آجائے گا مجھ سے کچھ تعرض نہ کرو گے۔ اب اگر تم اس بات پر قائم نہیں رہو گے تو میں تم سے مقابلہ کروں گا۔ حرامؑ نے بھی پھر خاموشی اختیار کی اور بات رفت و گذشت ہو گئی۔

ابن زیاد کا خط

حرامؑ کا رویہ امام کے ساتھ مشکوک تھا، جیسا کہ میں نے ”مجاہدہ کر بلا“ میں خیال ظاہر کیا ہے، ممکن ہے اس کے رسالہ کے کسی شخص نے ابن زیاد کو اطلاع دی ہو کہ حرامؑ کے ساتھ سختی کا برتاؤ نہیں کر رہا ہے اس کا نتیجہ تھا کہ ابن زیاد نے تنبیہ کی ضرورت محسوس کی اور حرامؑ کے نام یہ خط بھیجا کہ:

”تم کو لازم ہے کہ جہاں پر یہ خط پہنچے اور میرا قاصد آئے فوراً حسینؑ کو آگے بڑھنے سے روک دو اور انہیں ایسی جگہ قیام کرنے پر مجبور کرو جہاں آب و گیاہ موجود نہ ہو اور نہ کوئی قلعہ و جائے پناہ ہو۔ میں نے اپنے قاصد کو حکم دیا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ساتھ رہے اور اس وقت تک علیحدہ نہ ہو جب تک کہ میرے حکم کی تعمیل نہ ہو جائے۔“

آخری الفاظ صاف بے اطمینانی کا پتہ دے رہے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ حرامؑ کے متعلق یہ اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اس معاملہ میں رورعایت کرے گا یا سہل انگاری سے کام لے گا۔

(۱) ملاحظہ ہو شہدائے کربلا حصہ اول ص ۴۲-۴۹۔

اب حرامؑ بھی مجبور تھا۔ حقیقتہً مجبور نہیں بلکہ اس دنیا کی بندگی کی بنا پر جس سے واقعی حریت اسے ابھی نہیں حاصل ہوئی تھی۔ اس لئے اس خط کے آنے کے بعد اس نے امامؑ اور امام کے اصحاب کے سامنے یہ اعلان کر دیا کہ:

”یہ امیر ابن زیاد کا خط ہے اور اس میں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تم سب کو اسی جگہ اترنے پر مجبور کروں جہاں مجھے یہ خط پہنچے اور امیر کا قاصد موجود ہے اور اسے حکم ہے کہ یہ مجھ سے علیحدہ نہ ہو جب تک اس حکم کی تعمیل نہ ہو جائے۔“

ان الفاظ میں بھی کمزوری صاف نمایاں ہے۔ وہ حسینؑ کے سامنے اپنی بے بسی اور مجبوری کو پیش کئے دے رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ میں اپنی طرف سے سختی نہیں کرنا چاہتا۔ مگر اب میں خود زیر حراست و نگرانی ہوں۔

وہ ان الفاظ میں گویا درخواست کر رہا ہے کہ آپ مجھے اس کا موقع نہ دیجئے کہ میں اپنے ضمیر کے خلاف اس حکم کی تعمیل پر آمادہ ہوں اور عملی حیثیت سے کوئی مزاحمت کروں۔ اس کی اس صفائی کی حسینؑ نے قدر کی اور وہی حسینؑ جو اس کے پہلے اسی حرامؑ کی مزاحمت پر بگڑ گئے تھے اور کہا تھا:

”الموت ادنی الیک من ذلک۔“

”تجھے اس کے پہلے کہ مجھے روک لے موت کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

صرف اس کے اتنے کہنے پر وہیں اتر پڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ بیشک کچھ قریبی آبادیوں کا نام لیا کہ وہاں ہم کو پہنچ لینے دیا جائے مگر حرامؑ نے انہی الفاظ میں اپنی مجبوری کا اظہار کیا کہ مجھے حکم یہ ہے کہ آپ کو ایسی جگہ اتاروں جہاں آب و گیاہ نہ ہو اور یہ شخص میرے اوپر نگران مقرر کیا گیا ہے کہ یہ جا کر میرے طرز عمل کی اطلاع دے۔“

گویا وہ اپنی نسبت خطرہ کا اظہار کر رہا ہے اور یہ کہ ابن زیاد مجھ سے بدگمان ہو چکا ہے اور میری جانب سے اب ذرا

پھر تو امام کی خدمت میں جا بھی نہیں سکتا۔ اس گفتگو کی آواز امام نے سن لی فرمایا کہ حر کو آنے دو۔ جناب عباس حکم امام سے مجبور ہوئے، حر کو حاضری کی اجازت دی مگر حر کی تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اس شان سے امام کی خدمت میں لائے۔“

اس کی اصلیت بالکل اس سے مختلف ہے۔ میں نے اس واقعہ کو ”معرکہ کربلا“ (صفحہ ۱۶) میں لکھا ہے۔

آنے والا کثیر بن عبد اللہ شعبی تھا، طلایہ پھرنے والے ابو ثمامہ صاندی تھے۔ انہوں نے کہا ہتھیار کھول کر رکھ دو۔ اس نے انکار کیا۔ انہوں نے کہا اچھا میں تیری تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھے رہوں گا اور اس طرح تجھ کو لے جاؤں گا۔ اس نے اسے بھی گوارا نہ کیا۔ آخر ابو ثمامہ نے اسے خدمت امام میں نہ جانے دیا اور وہ واپس گیا۔ یہ پورا واقعہ وہ ہے جو اس شکل میں مشہور ہو گیا ہے۔ اس طرح کی روایتیں بہت مشہور ہیں جن کی اصلیت کچھ اور ہے اور ہم نے ان میں سے بعض کے متعلق حقیقت کا انکشاف اپنی مختلف کتابوں میں کیا ہے۔

عاشور کی صبح

عمر سعد نے صبح عاشور جب لشکر کو ترتیب دیا اور میمنہ و میسرہ مختلف افسروں کے سپرد کیا تو پھر قبائل کے اعتبار سے ایک تقسیم کی، اس میں حر کو بھی افسری کا عہدہ دوبارہ ملا۔

عبد اللہ بن زہیر بن سلیم از دی، جماعت اہل مدینہ پر۔ عبد الرحمن بن ابی سبرہ حنفی، مدحج واسد پر۔ قیس بن اشعث بن قیس ربیعہ و کندہ پر اور حر بن یزید ریاحی، تمیم و ہمدان پر افسر مقرر کئے گئے۔^(۱)

دوسری تاریخ محرم سے دسویں تک، اس آٹھ دن میں حر کی حالت کیا تھی؟ اسے تاریخ کے اندھیرے پردہ میں رہنے دیجئے۔ اور یہ راز منکشف ہوتا تو کیوں کر؟ جبکہ اس کا کوئی بتلانے والا رہا نہیں۔

(۱) طبری، ج ۶ ص ۲۳۱

بھی مراعات میرے واسطے مناسب نہیں ہے۔ حسینؑ اس کے انداز گفتگو اور طرز عمل کی ان تمام گہرائیوں کو سمجھ رہے تھے۔ وہ ابھی اس سے اس کی توقع نہیں کرنا چاہتے تھے کہ وہ دنیاوی زندگی کے خیال کو بالکل دل سے نکال دے اور اپنی جان کو قربان کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ کیونکہ اس کا نفس ابھی خام تھا اور اس کے پختہ ہونے میں تھوڑا وقفہ تھا۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ باوجود اصحاب میں جوش پیدا ہونے اور جنگ پر آمادہ ہو جانے کے امام نے ان سب کو روک دیا اور یہ فرمایا کہ ”میں جنگ میں ابتداء نہیں کرنا چاہتا۔“ اس کے معنی صاف ظاہر ہیں کہ جب اس نے عملی تصادم نہیں کیا ہے بلکہ سچائی کے ساتھ اپنا معاملہ میرے سامنے رکھ دیا ہے اور صرف زبانی اپنے مقصد کو میرے سامنے پیش کیا ہے تو مجھے عملی طور پر ایسی صورت نہیں لانا چاہئے کہ اس سے اور مجھ سے جنگ درپیش ہو۔

چنانچہ آپ نے آگے بڑھنے کا خیال ترک کیا اور اسی صحرائیں آپ اتر پڑے جہاں کے لئے حرنے کہا تھا۔

کربلا پہنچنے کے بعد

حسینؑ کے کربلا میں ٹھہرنے کے بعد حر نے ابن زیاد کو اطلاع دی۔

وہاں سے عمر بن سعد اس مہم کا ذمہ دار بنا کر بحیثیت افسر اعلیٰ کے بھیج دیا گیا۔ حر کی ذمہ داری ختم ہوئی اس کے بعد سے عاشور کے دن تک پھر حر کا کوئی ذکر تاریخ میں نہیں ملتا۔

ذاکرین جو یہ روایت پڑھتے ہیں کہ شبہائے عاشور میں سے کسی شب حر خدمت امام میں حاضری کے لئے آیا۔ جناب عباس طلایہ پھر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر امام کے پاس جانا ہے تو اسلحہ یہیں رکھ دو، حر نے انکار کیا اور کہا کہ سپاہی اپنے ہتھیار کسی کے سپرد نہیں کرتا۔ جناب عباس نے فرمایا کہ

لیکن بعد کی صورت حال اور حرکی گفتگوؤں نے صاف بتلادیا ہے کہ حرجس وقت سے امام حسینؑ کو کربلا میں پہنچا کر ابن زیاد کو اطلاع دے چکا اس وقت سے برابر خاموشی کے عالم میں انتہائی عمیق نگاہ سے مگر نیچینی کے ساتھ حالات کا مشاہدہ کرتا رہا۔

اس نے راستہ ہی میں اس طرح کی سلسلہ جنابی کی تھی کہ کسی طرح امام حسینؑ اور یزید یا ابن زیاد کے درمیان کچھ خط و کتابت ہو اور معاملات رو باصلاح ہو جائیں۔ اسے کربلا میں پہنچنے کے بعد بھی یہ توقع تھی کہ درمیان میں کوئی ایسا مشترک نقطہ پیدا ہو جائیگا جہاں امام اور ان کے مخالف مجتمع ہو جائیں اور جنگ کی صورت پیش نہ آئے۔ اسے کوفہ سے متواتر فوجیں آنے سے انتشار ضرور پیدا ہوا ہوگا مگر عمر سعد کا طرز عمل اس کے لئے امید افزا تھا جو خود صلح کی گفتگوئیں کر رہا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح جنگ نہ ہو۔

ایسا بھی وقت آیا جب سلسلہ گفتگو ایک ایسے نقطہ پر پہنچا جہاں عمر سعد تک نے یہ طے کر لیا کہ اب معاملہ یکسو ہو گیا۔ اور مقابلہ کی ضرورت نہیں باقی رہی۔ پھر ایسی صورت میں حرکویہ سمجھنے کی کیا وجہ تھی کہ جنگ ضرور ہوگی۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ امام کا طرز عمل روادارانہ ہے۔ آپ اپنی جانب سے معقول شرائط پیش کر رہے ہیں جن پر صلح نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

یہ توقعات تھے جو اس کے دل میں نویں محرم کی سہ پہر تک قائم تھے اور اس پر کیا، کسی شخص کو اس وقت تک اس امر سے مایوسی کے اسباب نہ پیدا ہوئے تھے کہ صلح نہ ہوگی مگر ۹ محرم کی شام کو یہ سب امیدیں منقطع ہو گئیں ابن زیاد کے اس خط سے جو شمر بن ذی الجوشن کے ہاتھ عمر سعد کے پاس پہنچا جس کے بعد عمر سعد مجبور ہوا کہ وہ اسی وقت امام کے لشکر پر حملہ آور ہو جائے اور بہت مشکل سے صرف ایک شب کی مہلت

عبادت خدا کے لئے منظور کرے۔

یقیناً یہ وہ وقت تھا کہ اب حقیقتاً حر کے سامنے امام حسینؑ سے جنگ اور ان کے قتل میں شرکت کا سوال پیش تھا اور اب وہ سمجھا کہ میں نے اس کے پہلے جتنے بھی اقدامات کئے وہ ایک مظلوم مقدس ہستی کو فنا کی منزل سے قریب کرنے کے سامان تھے۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور اس کے بعد پھر اب کیا مجھ کو اس سے بڑے اقدامات میں شرکت کرنا چاہئے۔ کیا میں حسینؑ کے خون میں اپنے ہاتھوں کو رنگین کر سکتا ہوں؟

اس کا ضمیر سختی سے انکار کرتا تھا کہ ہرگز نہیں، مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ اسے اب سب کچھ یاد آتا تھا کہ حسینؑ وہ انسان تھے جس نے اس سخت موقع پر مجھے اور میری تمام فوج کو پانی سے سیراب کیا۔ اب ان پر پانی بند ہے اور میری بدولت جس نے کہ انہیں اس بے آب و گیاہ جنگل میں اترنے پر مجبور کیا۔ اسے یہ احساس کر کے خود اپنی ہستی سے انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اس کا تذکر کیا ہے۔ میں حسینؑ کے پاس جا کر اپنی اس خطا کو معاف کراؤں۔ مگر کیا اتنا بڑا جرم دنیا میں معافی کے قابل بھی ہے؟! پھر اگر حسینؑ نے میری خطا کو معاف نہ کیا تو میں کہاں کا رہا۔ نہ دنیا ملی، نہ آخرت۔ پھر بھی اس کا ضمیر کہتا تھا کہ چل کر معافی مانگنا تو چاہئے۔ انہوں نے نہ بھی معاف کیا، پھر بھی اپنی امکانی کوشش تو اس دھبے کے اپنے دامن سے مٹانے کی کرلوں گا۔ میں جب اپنی جان ان کے قدموں پر ڈال دوں گا تو پھر وہ بھی کریم النفس ہیں کہاں تک خیال نہ کریں گے۔

یہ خیالات تھے جو اس کے دماغ میں ایک تلاطم برپا کئے ہوئے ہوں گے۔ اور وہ شب عاشور ہی تھی جس کی سیاہی کے بے پایاں سمندر میں اس کے خیالات کی کشتی تھپڑے کھا رہی تھی اور کسی مرکز پر ٹھہرتی نہ تھی۔

ہو مارتا ہوا جنگل اور رات کا سناٹا، صفحہ تاریخ بھی

سنان ہے، کون مورخ ہے جو اس معرکہ کی داستان قلمبند کرے جو حر کے دل و دماغ میں برپا رہا۔

ہاں البتہ ”الشعراء تلامیذ الرحمن“ سچا شاعر حقیقت کا ترجمان ہوتا ہے۔ میرانیس علیہ الرحمہ اور ان کے خاندان کے دوسرے باکمال مرثیہ گوئیوں نے جس طرح اس رات حر کی حالت کی تصویر کشی کی ہے وہ یقیناً ایک صحیح واقعہ ہے جس کی روایت خاموش فطرت کے واسطے سے شاعر کے دل تک پہنچی ہے اور واقعات کے قرائن اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ رات کسی طرح گزری اور صبح ہوئی، حر کو پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اب کیا ہوتا ہے؟ کیا واقعی جنگ ہی ہوگی یا کوئی اور صورت رونما ہوگی۔ اس نے انتہائی ضبط و صبر کے ساتھ دیکھا کہ فوج کی ترتیب ہوئی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ایک حصہ فوج کا افسر قرار دیا گیا ہے۔ اس نے امام کا بے نظیر اور مؤثر خطبہ سنا جس نے اس کے دل کے تاثرات میں اور اضافہ کر دیا۔ مگر پھر اس نے انتظار کیا کہ اس کا اثر مخالف فوج پر کیا پڑتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ زہیر بن قین نے بڑھ کر تقریر شروع کی اور ناصحانہ انداز میں اہل کوفہ کو مخاطب کیا، ان تمام باتوں کے بعد بھی اسے احساس ہوا کہ فوج ابن زیاد جنگ پر آمادہ ہے اور اس کے ارادوں میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے۔ بس اب حر کے ضبط و صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ اور وہ خیال جو اس کے دل میں پرورش پا رہا تھا اب رازداری کے حدود سے آگے بڑھ گیا۔

عمر سعد سے گفتگو

حر آیا عمر سعد کے پاس، کہا^(۱):-

”أما قاتل انت هذا الرجل۔“

”کیا تم ان سے واقعی جنگ کرو گے؟“

یہ سوال اپنے اندر ان سب قلبی کیفیتوں کو مضمر رکھتا ہے

(۱) تاریخ طبری، ج ۶ ص ۲۴۴

جن کی تشریح کے لئے میں کئی صفحے سیاہ کر چکا ہوں۔ اسے یہ یقین آنے کے قابل بات ہی نہیں معلوم ہوتی کہ فرزند رسول سے جنگ عملی شکل بھی اختیار کرے گی۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ آثار و قرائن کو جنگ کے قطعی پارہا ہے۔ مگر پھر بھی اس کی آرزو رکھتا ہے کہ یہ سب نمائشی ہو اور اس میں حقیقت بالکل نہ ہو۔

عمر سعد اس کے ضمیر کے اندرونی کیفیات سے بالکل بیگانہ تھا اس نے افسرانہ انداز میں بڑے اطمینان کے ساتھ کہا:-

”ای واللہ قتالا ایسرہ ان تسقط الرؤس و تطیح الایدی۔“

”ہاں ہاں! بخدا ایسی جنگ جس کا انتہائی کم نتیجہ یہ ہے کہ سروں کی بارش ہو اور ہاتھ کٹ کٹ کر زمین پر گررتے ہوں۔“

”افما لکم فی واحدة من الخصال الی عرض علیکم رضا۔“

”کیا اتنے مطالبے جو حسینؑ نے پیش کئے ان میں سے کوئی تم لوگوں کے نزدیک منظوری کے قابل نہیں ہے؟“

دیکھا آپ نے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ صلح کی گفتگو کو پورے غور سے نتیجہ کی جستجو کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ حسینؑ کے مطالبات ضرور مان لئے جائیں گے۔

عمر سعد نے کہا:-

”واللہ لو کان الامرا الی لفعلت لکن امیرک قد ابی ذلک۔“

”خدا کی قسم اگر معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں ضرور منظور کر لیتا لیکن کیا کروں کہ تمہارا حاکم (ابن زیاد) نہیں مانتا۔“

عمر سعد کے جواب میں خود کمزوری تھی، اس کا مضمون حرؑ

کی رائے اور خیال کو اور تقویت دینے والا تھا۔ وہ تسلیم کر رہا تھا کہ حسینؑ کا مسلک صلح پرورانہ ہے مگر ابن زیاد کی ضد حسینؑ کے قتل ہی کی طالب ہے۔

اس کے بعد حرؑ نے کچھ گفتگو کرنا بیکار سمجھا۔ اور اب یہ وقت آ گیا تھا کہ وہ اس اپنے فیصلہ کو جو بہت مشکل سے اس کے دل و دماغ کی جنگ سے طے پایا تھا عملی لباس پہنائے۔

فوج مخالف سے علحدگی

حرؑ کو یہ اندیشہ ضرور تھا کہ اگر فوج سے نکلنے کے پہلے یہ اطلاع ہو جائے کہ میری نیت میں کچھ تبدیلی ہو رہی ہے تو مجھے یہیں گرفتار کر لیا جائے گا اور میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گا۔ اس لئے وہ اس وقت بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ اس کے قبیلہ کا ایک شخص قرہ بن قیس اس کے ساتھ تھا۔ حرؑ اس کا رہنا ناگوار ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ کسی طرح میرے پاس سے ٹل جائے مگر کچھ بتانا تھا۔ آخر اس نے کہا ”قرہ! آج تم نے گھوڑے کو پانی نہیں پلایا؟“ اس نے کہا: ”نہیں، ابھی نہیں۔“ کہا: ”پھر پلاؤ گے نہیں؟“

انسان کا چہرہ، اس کی بات چیت، اس کے چہرہ کارنگ، سب ہی اس کے خلاف جاسوسی کرتے ہیں۔ حرؑ لاکھ چھپائے مگر دل کا اضطراب چھپنے کی چیز نہیں۔ قرہ کچھ نہ سمجھا۔ اتنا تو سمجھ لیا کہ یہ مجھے اپنے پاس سے ٹالنا چاہتے ہیں اور چونکہ وہ سنجیدہ شخص تھا۔ (ملاحظہ ہو ”معرکہ کربلا“ ص ۱۷) اس لئے وہ ہٹ گیا۔ حرؑ نے اپنے خیال میں بڑی فتح حاصل کی۔ اس نے آہستہ آہستہ گھوڑا اپنا فوج امام کی طرف بڑھانا شروع کیا۔ اس کا دل دھڑک رہا ہوگا، اس کے سینہ میں طوفان برپا ہوگا وہ سمجھتا تھا اب میں کہیں اور ہوں مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ میں دنیا سے علحدہ ہوں۔

اس وقت کسی کا ٹوک دینا! مہاجر بن اوس، اسی کے قبیلے کا شخص، اس نے کہا:

”کیوں حرؑ! کیا ارادہ ہے؟ کیا حملہ کرنا چاہتے ہو؟“ وہ چونک پڑا۔ ”حملہ کرنا چاہتے ہو؟“ حرؑ اس کا کیا جواب دیتا؟ اس نے پھر بھی پردہ داری کی کوشش کی۔ کچھ جواب نہیں دیا۔ مگر جسم میں لرزہ سا پیدا ہو گیا۔

راز فاش تھا، مہاجر نے کہا: ”حرؑ! تمہاری یہ کیا حالت ہے؟ میں نے تو تمہاری یہ حالت کبھی نہیں دیکھی۔ مجھ سے پوچھا جاتا کہ کوفہ میں سب سے زیادہ بہادر کون ہے تو تمہارے سوا کسی کا نام نہ لیتا۔ مگر اس وقت میں تمہاری عجیب حالت دیکھ رہا ہوں۔ یہ آخر ہے کیا؟“

یہ شجاعت پر حملہ تھا۔ حرؑ اس غلط فہمی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے چھپانے کی مہم میں اپنی شکست کا احساس بھی کر لیا اس لئے اب صاف کر دینا چاہا کہا:۔

”میرے سامنے اس وقت جنت و دوزخ کا سوال ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا اور الفاظ کی رفتار کے ساتھ دل کی بیچنی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

”میں تو جنت پر کسی چیز کو مقدم نہ سمجھوں گا چاہے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے جائیں اور آگ میں جلا دیا جائے۔“

اب دیر کا موقع نہ تھا۔ یہ کہتے ہی اس نے گھوڑے کو چابک لگایا اور لشکر امام حسینؑ کی طرف پہنچ گیا۔^(۱)

عفو گناہ

حرؑ کو اندیشہ تھا کہ اس کے بے تحاشا گھوڑا اڑائے ہوئے آنے سے انصار امامؑ میں دہشت نہ پیدا ہو۔ اور کہیں اس کی مزاحمت نہ کی جائے، اس لئے اس نے لشکر امام کے قریب پہنچتے ہی اپنی سپر پلٹ کر ہاتھ میں لے لی۔^(۲)

یہ عرب کے دستور کے مطابق تھا۔ جب کوئی حملہ آور ہو تو اس کے ہاتھ میں تلوار کھینچی ہوئی ہوگی، سپر حفاظت کے لئے

(۱) طبری، ج ۶ ص ۲۴۴ (۲) انصار العین، ص ۱۱۹

اپنی صفائی میں اسباب بھی وہ پیش کئے تھے جو حقیقت کے مطابق تھے اور جن پر شروع سے اس کا طرز عمل صاف طور پر منطبق تھا، وہ معلوم ہوتا تھا کہ واقعی بچپن ہے اور اپنے جرم کے احساس سے مضطرب ہے۔

یہ موقع اس کا نہیں ہے کہ امام کسی طول طویل تقریر کے ساتھ اس کی بات کا جواب دیں۔ آپ کو اسے مطمئن کرنا چاہئے فوری طور پر۔ آپ نے بلا توقف فرمایا:-
”ہاں ہاں۔ خدا تمہاری توبہ قبول کرے گا اور تمہیں بخش دے گا۔ ذرا اپنا نام تو بتاؤ۔“

یہ بشارت دینے کی تمہید ہے۔ اسم سے مسیٰ کی مطابقت دکھانا ہے۔

اس نے کہا: ”حز بن یزید“ فرمایا: ”انت الحر کما سمعتک امک انت الحر ان شاء اللہ فی الدنیا والآخرۃ۔“ تم حر ہو (آزاد) اسی طرح جیسے تمہاری ماں نے نام رکھا ہے۔ تم آزاد ہو انشاء اللہ۔ دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔“

”گھوڑے سے تو اترو۔“ حزن نے کہا: ”میں آپ کی نصرت میں گھوڑے پر سوار ہوں، بہتر ہے اس سے کہ نیچے اتروں بس ایک تھوڑی دیر ان سے جنگ کر لوں پھر تو (مر کر) گھوڑے سے نیچے اترنا ہی ہے۔“

امام نے دیکھا کہ حر گولولہ جہاد کا ہے۔ فرمایا:

”فاصنع یرحمک اللہ ما بادلک“

”اچھا تمہاری خوشی جو ہو وہ کرو۔ خدا اپنی رحمت تمہارے شامل حال کرے۔“^(۱)

حر کی پر جوش تقریر

وہ ضبط بہت کر چکا تھا، اب وقت تھا کہ اس کے خیالات کا کوہ آتش فشاں شگافتہ ہو، اس کی چنگاریاں اڑیں اور شعلے

سامنے ہوگی۔ لیکن اگر وہ تلوار کو نیام میں رکھ لے، سپر کو الٹا کر لے تو تو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ امان کا طالب ہے یا کچھ پیام لا رہا ہے۔ حزن نے اپنی سپر اس طرح ہاتھ میں لے کر گویا پہلے سے بتلا دیا کہ میں طالب امان ہو کر آ رہا ہوں جنگ کا ارادہ نہیں رکھتا ہوں۔^(۱)

حر کے اس اچانک آنے سے سب لوگ متعجب ضرور ہوں گے اور چشم براہ ہوں گے کہ یہ آ کر کیا کہتا ہے۔ وہ سیدھا امام کے سامنے آیا۔ کہنے لگا:-

”میری جان آپ پر خدا۔ اے رسول کے فرزند میں وہی گنہگار ہوں جس نے آپ کو واپس جانے سے روکا، راستہ میں آپ کے ساتھ ساتھ رہا اور آپ کو اس جگہ ٹھہرنے پر مجبور کیا۔“ یہ وہ فرد قرار داد جرم ہے جو اس کے ضمیر نے خود اپنے خلاف مرتب کر لی تھی۔ ”قسم اس خدائے برحق کی جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں کہ مجھے یہ گمان ہرگز نہیں تھا کہ یہ لوگ آپ کے تمام شرائط کو جو آپ پیش کریں گے مسترد کر دیں گے اور نوبت یہاں تک پہنچے گی۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا تھا کہ کیا حرج ہے میں کسی حد تک ان لوگوں کا ساتھ دوں اور معلوم نہ ہو کہ میں ان کی اطاعت سے باہر ہوں۔ پھر یہ لوگ ان شرائط کو تو قبول کر ہی لیں گے جو امام حسینؑ ان کے سامنے پیش کریں گے۔ بخدا اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ یہ لوگ ان شرائط کو آپ کی منظور نہیں کریں گے تو میں کبھی آپ کے ساتھ یہ طرز عمل اختیار نہ کرتا۔ اچھا اب میں حاضر ہوا ہوں انتہائی شرمسار، توبہ کرتا ہوا اپنے گناہ سے خدا کی بارگاہ میں اور آپ کا شریک مصیبت ہو کر اپنی جان کے ساتھ یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر مرجاؤں۔

کیا اس طرح میری توبہ قبول ہو جائے گی؟“

حزن نے اپنے جرائم خود ہی پیش کر دیئے تھے۔ اس نے

بلند ہوں۔

ان کے ہاتھ سے قتل ہوئے جس کے نتیجہ میں وہ کچھ زخمی بھی ہوئے۔ ان کے بائیں ہاتھ کی انگلیاں قطع ہو گئیں۔ اس وقت حر کو خیال ہوا کہ میں تاخیر کر رہا ہوں۔ کسی ناصر امام کو مجھ سے پہلے قتل نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ پہلے مجھ ہی کو جاں نثار کرنا چاہئے۔ یہ سوچ کر وہ خدمت امام میں حاضر ہوا اور عرض کیا:۔
”فرزند رسول! میں سب سے پہلے آپ سے لڑنے کو آیا تھا لہذا اب مجھے اجازت دیجئے کہ سب سے پہلے میں ہی آپ کے سامنے قتل ہوں اور آپ کے جد بزرگوار سے جا کر دست بوسی کروں۔“

ان الفاظ کے متعلق جو ایک بحث پڑ گئی ہے وہ میں نے ’محاربہ کربلا‘ (صفحہ ۱۲-۱۱) میں لکھی ہے۔
میں نے کہا کہ حر کے الفاظ بالکل حقیقت پر محمول ہیں۔ حر کی اس اجازت جہاد کے پہلے ہرگز کوئی شخص شہید نہیں ہوا تھا۔ حر نے اجازت اسی خیال سے مانگی کہ وہ جا کر لڑیں گے اور شہید ہوں گے تو اس صورت سے اول شہید قرار پائیں گے۔ امام نے اجازت دی اور حر میدان جنگ میں آئے۔

دھج

حر کی زبان پر یہ اشعار جز میں جاری ہوئے۔
اِنِّی اَنَا الْحَرَّوَمَا وَی الضَّیْفِ
اضْرِبْ فِیْ اَعْنَاقِکُمْ بِالْسَّیْفِ
عَنْ خَیْرِ مَنْ حَلَّ بِارْضِ الْخِیْفِ
اضْرِبْکُمْ وَلَا اَرِیْ مِنْ حِیْفِ
”میں حر ہوں اور مہمانوں کا پناہ دینے والا ہوں، میں تمہاری گردنوں پر تلوار چلاؤں گا۔ اس امام کی جانب سے جو سر زمین مکہ کا سب سے بہتر رہنے والا ہے۔ میں تم کو تلواریں لگاؤں گا اور ذرا بھی اس کو ظلم نہیں سمجھوں گا۔“

حملہ اور جنگ

اس رجز کے بعد حملہ کر دیا، اور شمشیر زنی شروع کی اس

حر نے اہل کوفہ کی فوج کے سامنے آ کر تقریر شروع کی۔
”اے کوفہ والو! تمہاری مائیں تمہارے غم میں روئیں۔ تم نے اس بزرگوار کو بلایا اور جب وہ آیا تو تم نے اسے دشمن کے سپرد کر دیا۔ تم نے خیال ظاہر کیا تھا کہ تم ان پر جان نثار کرو گے پھر تم نے خود ان پر چڑھائی کر دی اور ان کے قتل پر آمادہ ہو گئے۔ تم نے ان کے نفس کے آمدور شد کو مسدود کر رکھا ہے اور گلا گھونٹنے پر آمادہ ہو اور چاروں طرف سے انہیں گھیر رکھا ہے۔ تم نے ان کو خدا کی چوڑی چکلی زمین میں جدہ روہ امن کا راستہ پائیں جانے سے روک دیا ہے اور وہ تمہارے ہاتھ میں قیدی کی طرح سے ہو گئے ہیں اور بے بس ہیں۔ اور تم نے ان کو، ان کے اہل حرم اور بچوں کو اور ان کے اصحاب کو فرات کے بہتے ہوئے پانی سے روک دیا ہے۔ وہ پانی جس کو یہودی اور مجوسی اور نصرانی تک پیتے ہیں اور عراق کے سور، کتے تک اس میں آکر لوٹتے ہیں۔ اور یہ لوگ ہیں کہ ان کو پیاس نے جاں بلب کر رکھا ہے۔

کیا برا ہے وہ سلوک جو تم نے محمد مصطفیٰ کے بعد ان کی اولاد کے ساتھ کیا ہے۔ خدا تم کو اس شدت کے پیاس والے دن سیراب نہ کرے۔ اگر تم ابھی، آج، اسی دم توبہ نہ کر لو اور اپنے طرز عمل سے پشیمان ہو کر باز نہ آ جاؤ۔“

دشمن کو تقریر حر کی ناگوار تھی۔ کچھ پیادوں نے فوج کے حملہ کیا۔ تیر چلائے حر نے تقریر موقوف کر دی۔ جنگ باقاعدہ شروع نہ ہوئی تھی، اس لئے وہ آکر امام کے سامنے کھڑا ہو گیا۔^(۱)

اذن جہاد

لڑائی شروع ہو چکی، عبداللہ بن عمیر کلبی میدان جنگ میں ایک کارنمایاں کر چکے یعنی ابن زیاد کے دو غلام یسار و سالم

(۱) طبری، ج ۶ ص ۲۴۵

جنگ مغلوبہ میں شرکت

ظہر کے قریب فوج دشمن نے تیروں کا مینہ برسایا اور ادھر سے اصحاب امام حسینؑ نے بھی مجموعی حیثیت سے تلواریں کھینچ کر حملہ کر دیا یہی وہ عظیم جنگ ہے جو تاریخ میں حملہ اولیٰ کے نام سے مشہور ہے۔^(۱)

اس جنگ میں حرنے بھی حصہ لیا اور ان کا گھوڑا جو اس کے پہلے زخمی ہو چکا تھا اس موقع پر پے ہو گیا اور وہ مثل تمام اصحاب امام حسینؑ کے جن کے گھوڑوں کا اس حملہ میں خاتمہ ہو گیا تھا پیادہ ہو گئے جس کا تذکرہ ان کے دشمن ایوب بن مشرح حیوانی نے اس طرح کیا ہے کہ:-

میں نے حرن یزید کے گھوڑے کو تیر لگایا جس سے وہ تھرا کر منہ کے بھل گرا۔ حر چھلانگ مار کر زمین پر آئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر ہے اور تلوار ان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ یہ شعر پڑھ رہے تھے:-

ان تعقروا بی فانا ابن الحر
اشجع من ذی لبدهزبر
”میں ایک شریف کا فرزند ہوں اور شیر سے زیادہ شجاعت کا مالک ہوں۔“

جنگ کا یہ عالم تھا کہ (راوی کہتا ہے) میں نے کوئی اس طرح کا شمشیر زنی کرنے والا نہیں دیکھا۔^(۲) اس جنگ مغلوبہ میں دشمن کو شکست ہوئی اور حراس موقع پر بھی شہید نہیں ہوئے۔

آخری جنگ اور شہادت

دو پہر ڈھل چکی، نماز ظہر کا وقت آیا اور ابو ثمامہ صاندی نے امامؑ سے نماز جماعت کے لئے کہا۔ امامؑ کی جانب سے فوج مخالف سے مہلت نماز کی درخواست کی گئی اور اس کا جواب ناگوار ملا جس پر حبیب بن مظاہر کو تاب نہ رہی اور انہوں نے

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو محاربہ کربلا، ص ۲۷-۲۵

(۲) طبری، ج ۶ ص ۲۵۰

وقت جب حر لشکر سے جدا ہو کر امام حسینؑ سے جا کر ملا ہے تو بنو حارث بن تمیم کے ایک شخص نے جس کا نام ”یزید بن سفیان“ تھا یہ کہا کہ بخدا اگر میں دیکھ لیتا حر کو اس وقت جب وہ نکل رہا تھا تو ایک نیزہ میں اس کا کام تمام کرتا اب جب کہ حرن تنہا اتنی بڑی فوج میں جنگ کر رہا تھا، آگے بڑھ کر تلواریں لگا رہا تھا اور عشرہ کا یہ شعر اس کی زبان پر تھا:-

مازلت ارمیہم بشجرة نحرہ
ولبانہ حتی تسر بل بالدم

”میں برابر ان کے اوپر پھینکتا رہا اپنے گھوڑے کی گردن اور اس کے سینہ کو یہاں تک کہ اس گھوڑے نے سر سے پاؤں تک خون کی چادریں اوڑھ لیں۔“

یہ شعر بالکل اس کے حسب حال تھا کیونکہ اس کا گھوڑا زخمی ہو چکا تھا، اس کے سرو چہرہ پر تلواریں پڑی تھیں اور خون بہہ رہا تھا۔ اس وقت حصین بن تمیم، اس قادیسیہ والی فوج کے افسر نے جس کا حر پہلے ماتحت تھا یزید بن سفیان سے کہا کہ ”دیکھو حر یہی تو ہے جسے قتل کرنے کی تم آرزو رکھتے تھے۔“ اس نے کہا ”اچھا“ یہ کہہ کر وہ باہر نکلا اور آواز دی۔ ”حر بن یزید! کیا مقابلہ منظور ہے؟“ حر نے کہا ”ہاں ضرور“ یہ کہہ کر سامنے آگئے۔ خود حصین کا قول بیان کیا گیا ہے کہ بس یہ معلوم ہوا جیسے یزید کی جان حر کے قبضہ میں تھی۔ دم کے دم میں قتل ہو گیا۔^(۱)

یہ ایسا پر ہیبت منظر تھا کہ دشمن کا پرا بند ہو گیا اور حر کے مقابلہ کو پھر کوئی نہیں نکلا۔ آخر حر اپنے گھوڑے کو جو زخمی ہو چکا تھا موڑ کر اپنے مرکز کی جانب واپس آگئے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ حر سب سے پہلے شہید ہیں۔ اس کی بنیاد ان کی طلب رخصت والے الفاظ پر ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ اس حملہ میں شہید نہیں ہوئے۔ ان کے پہلے وہ تمام لوگ شہید ہوئے جن کا تذکرہ اس سے پہلے ”حصہ اول“ میں ہو چکا ہے۔

(۱) طبری، ج ۶ ص ۲۴۸

امام کی قدر افزائی

امام نے اپنے اس ناصر کی یہ قدر کی کہ جب اس کی لاش میدان سے اٹھا کر لائی گئی اور حضرت کے سامنے رکھی گئی تو آپ خاک و خون حر کے چہرے سے صاف کرنے لگے اور فرمانے لگے:-

”انت الحر کہا سَمْتَكَ امك وانت الحر في الدنيا وانت الحر في الآخرة۔“

”تم بیشک حر ہو۔ تمہاری والدہ نے تمہارا نام حر بہت ٹھیک رکھا تھا۔ تم دنیا میں بھی حر ہو، اور آخرت میں بھی حر۔“
یہی الفاظ ہیں جو آپ خود حر سے اس کی زندگی میں ارشاد فرما چکے تھے اور یہی اس کی لاش پر بھی آپ نے کہے۔

امام کا سلام

زیارت شہداء میں جو تحفۃ الزائر میں مذکور ہے حر پر بھی سلام موجود ہے:-

”السلام علی الحر بن یزید الریاحی۔“

کیا کہنا حر کی اس سعادت شہادت کا جس نے اس کو سلام امام کا مستحق بنادیا۔

معتبر کتابوں سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حر کے ساتھ اس کا فرزند، غلام یا بھائی بھی تھا۔ لیکن سپہر کاشانی نے بعض غیر معروف کتابوں سے اس کو نقل کیا ہے:-

”حر روئے باپسر خود علی کرد و گفت اے فرزند بریں قوم ستمگار ترک تازی کن و چند کہ توانی داد جہاد بدہ پسر حراسپ برانگیخت و بر سپاہ کوفہ حملہ گزید افگند کوفیاں اور اد پر دہ افگند و در زمے صعب دادند، در شرح شافیہ مسطور است کہ پسر حر بیست و چہار کس از مشرکین را مقتول ساخت و ابو مخنف گوید ہفتاد کس بکشت آنگاہ مقتول گشت، حرا از شہادت فرزند عظیم شاد شد و قال الحمد لله الذی

حملہ کر دیا۔ آخر درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ اس کا اثر جو امام پر ہوا وہ بھی آپ حصّہ اول میں پڑھ چکے۔

کہاں حر کا وہ ارادہ کہ سب سے پہلے شہادت کا درجہ وہ حاصل کرے اور کہاں اتنی تاخیر کہ حبیب بن مظاہر ایسا مخصوص امام کا ساتھی شہید ہو جائے اور حر باقی رہے۔

امام کے چہرہ پر شکستگی کے آثار نے بھی اصحاب کے دل پر خاص اثر کیا۔ حر نے اب مضبوط ارادہ کر لیا کہ وہ اب اپنی منزل مقصد پر پہنچ جائے، اس نے یہ جرز پڑھی:-

الیت لا اقتل حتی اقتلا

ولن اصاب الیوم الا مقبلا

اضربهم بالسيف ضربا مفصلا

لانا کلا عنهم ولا مهلا

”میں قسم کھاتا ہوں کہ قتل نہ ہوں گا جب تک دشمنوں کو قتل نہ کر لوں اور مارا نہ جاؤں گا مگر پیش قدمی کی حالت میں۔ میں آج تلواریں لگاؤں گا فیصلہ کن تلواریں، نہ میرے قدم پیچھے ہٹیں گے اور نہ کمزوری کا اظہار ہوگا۔“
کبھی یہ شعر پڑھتے تھے:-

اضرب فی اعراضهم بالسيف

عن خیر من حل منی والخیف

”میں شمشیر زنی کروں گا اس بہترین انسان کی جانب سے جس نے سرزمین حرم میں کبھی قیام کیا۔“

معلوم نہیں امام کا اشارہ تھا اور حر کا خیال یا خود اپنی جانب سے کہ زہیر بن قین نے حر کے ساتھ مل کر جہاد شروع کیا۔ حالت یہ تھی کہ جب ایک گھر جاتا تھا تو دوسرا بڑھ کر اسے چھڑانے کی کوشش کرتا تھا۔ تھوڑی دیر یہی صورت قائم رہی۔ لیکن اس کے بعد پیادوں کی فوج نے حر کو سختی سے گھیر لیا۔ اور زہیر کی مدافعت ناکام ہوئی آخر حر قتل ہو گئے۔^(۱)

(۱) طبری، ج ۶ ص ۲۵۲

رزقك الشهادة بين يدي مولانا الحسين بن
امير المؤمنين عليهما السلام۔“^(۱)

’شرح شافیہ‘ جس کا حوالہ دیا گیا ہے بالکل مبہول ہے۔ ابو مخنف کی اصل تاریخ اگر دستیاب ہوتی تو وہ بہت کچھ معتبر سمجھی جاسکتی تھی مگر افسوس ہے کہ اس اصل تاریخ کا وجود نہیں ہے اور ابو مخنف کا نام عام تاریخوں میں اس طرح لیا جانے لگا ہے جیسے مقامات حریری میں ’حارث بن ہمام‘۔

تاریخ ’روضۃ الاحباب‘ میں جو محدث جمال الدین اصفہانی کی تصنیف ہے، حرّ کے بھائی مصعب بن یزید ریاحی کا بھی تذکرہ ہے اور لکھا ہے کہ جب حرّ میدان جنگ میں آیا اور رجز پڑھنے لگا تو اس کا بھائی مصعب جو ابھی لشکر عمر سعد میں تھا گھوڑا دوڑا کر آگے بڑھا، فوج والے سمجھے کہ وہ اپنے بھائی کے مقابلہ کو جاتا ہے۔ جب قریب آیا تو اس نے حرّ کی تعریف کی اور کہا کہ آپ نے مجھے بھی ہدایت کا راستہ دکھلایا۔ میں بھی توبہ کرنے کے لئے آیا ہوں۔ حرّ اس کو امام کی خدمت میں لائے اس نے توبہ کی اور اصحابِ امام کی صف میں کھڑا ہو گیا۔^(۲) حرّ کی شہادت کے بعد مصعب نے اجازت جہاد حاصل کی اور جنگ کر کے شہید ہوا۔^(۳)

قطعه

نہ جاتے آپ اگر دشتِ کربلا کی طرف
نگاہِ ہند میں جلوے سما گئے ہوتے
دلوں کے فرش بچھا دیتے خیرِ مقدم کو
حسینؑ! آپ جو بھارت میں آگئے ہوتے

(بقیہ صفحہ نمبر ۴۳ کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

امام حسینؑ کو خدا سید الشہداءؑ کہتا ہے، جبرئیل کہتے ہیں، حضرت نوحؑ سید الشہداءؑ سمجھتے ہیں یہی وجہ ہیں جن سے اہل سنت کے علماء ہر دور میں امام حسینؑ کو سید الشہداءؑ تسلیم کرتے رہے۔ اور آج بھی بصد فخر شہیدوں کا سردار کہتے ہیں جن کو ہم بخوف طول ترک کرتے ہیں۔

سوادِ اعظم کی معتبر تاریخ سے فرزندِ رسول کی سرداری ثابت ہو چکی جس کے بعد اب کی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں۔ اسلامیانِ عصر کی تشفی کے لیے پیغمبرِ ماکول کافی ہے خاتمہ کلام میں ہم یہ چاہتے ہیں کہ اگر کوئی غیر مسلم عیسائی ہم سے ایسا مطالبہ کرے تو ان کی مقدس کتاب بھی بارہ اماموں کی سیادت کے جوہر سے لبریز ہے۔ بائبل میں موجود ہے۔

(کتاب مقدس پرانا اور نیا عہد نامہ ۱۸)



سید الشہداء حضرت امام حسینؑ

شہادت سے ہزاروں برس پہلے کا لقب، پیغمبر اسلامؐ کا وحی آموز کلام!

زبدۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی صاحب قبلہ

بتاتے ہیں کہ حضرت ختمی مرتبت نے امام حسینؑ کو کس موقع پر سید الشہداء کہا ہے۔ پہلے امام حسینؑ کی شخصیت اور ان کی خاندانی عظمت و وقار کو دیکھنا چاہیے تو فیصلہ آسان ہے کہ حسینؑ کی طینت میں تمام بزرگیاں سمٹ کر جمع ہو گئی تھیں اور ان کی ذات میں سیادت کی بے پناہ صلاحیت تھی قدرت نے ان کی سیادت کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا۔ نانا نبی آدم کے سردار باپ عرب کے سردار، مان زنان بہشت کی سردار، بھائی جوانان جناب کے سردار، اس ماحول میں حسینؑ کی پرورش ہوئی۔ سرداری کے بچنے ہی سے حقدار تھے۔ جتنی عمر بڑھتی گئی سیادت کا جو ہر چمکتا گیا سرداری آپ کی خاندانی حیثیت سے صحیح بخاری ترمذی۔ صحیح مسلم، مشکوٰۃ، مسند احمد بن حنبل، سنن ابن ماجہ تاریخ کامل بن اثیر، ریاض القرۃ، کنز العمال، معجم طبرانی حلیۃ الاولیاء، مناقب خطب، مناقب ابن مردویہ، مناقب ترمذی، نور العین ابن فراہنی وغیرہ سے ثابت ہے۔ اس کے بعد سید الشہداء ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے اور ہر سنجیدہ شخص سمجھ سکتا ہے کہ جب عمومی حیثیت سے جوانان جنت کی سرداری ثابت ہے تو بلا استثناء اہل بہشت کے ہر طبقہ کا سردار ہونا بھی قابل تسلیم ہے انبیاء اوصیاء صابر مظلوم صدیق شہید سب کے برابر سے سردار ہیں اور پیغمبرؐ کا قول الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ خود سید الشہداء کہنے کی حمایت کر رہا ہے بنا بریں سید الشہداء کا لقب نبوی ارشاد کی ایک فرع کی حیثیت رکھتا ہے۔ مدیرانجم اگر اس فلسفہ پر غور کریں تو ہم سے نص نبوی کے مطالبہ کی ہمت نہ ہو۔

مخالفین عزاداری میں بڑے سے بڑا شخص جب قلم اٹھاتا ہے جہالت پر مبنی ہوتا ہے۔ عزاداری کو غلط فہمیوں کا نشانہ بنانا آجکل کی تہذیب ہے اور عزاداری کے نفوذ و ارتقا سے دشمنان اہلبیت انگاروں پر لوٹتے ہیں۔ اسلامیان ہند کے نام نہاد آرگن انجم لکھنؤ کو امام حسینؑ کے سید الشہداء ہونے میں عذر ہے اور عزاداری پر مختلف حملہ کرتے ہوئے شہداء کی ذات پر بھی حملہ شروع کر دیا ہے۔

”حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نام نامی کے ساتھ سید الشہداء کا استعمال کسی مذہبی روایت یا نص نبوی پر مبنی نہیں ہے۔“

انجم شہداء نمبر ۱۱ محرم ۱۳۵۵ھ سید الشہداء کے لقب سے انکار فخر کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند کو دنیا کی نگاہوں میں سبک کرنا ہے۔ اس موقع پر نص نبوی کا مطالبہ صحیح بھی ہے یا نہیں پہلے اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ حسینؑ کے نام لیوا شہادت عظمیٰ کے بعد صبر و سکون کی منزل سے کوسوں دور تھے، ہر طرف اموی و عباسی مظالم کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ آل رسول کا نام لینا ناقابل عفو و خطا، ان کے فضائل بیان کرنا سنگین جرم تھا جس کی پاداش میں گدی سے زبان کھینچ لی جاتی ہے ان کو کہاں اس کا موقع ملتا کہ شہادت حسینؑ پر رسولؐ عربی کے ارشادات بے خوف ہو کر ہم تک پہنچائیں اور ہم انجم ایسے فتنہ پسند اخبارات کے جواب میں اس کو پیش کریں۔ آج خدا معلوم نص نبوی کی کیوں تلاش ہے وہ دن بھول گئے جب پیغمبرؐ کے ارشاد کو روندنا شروع کر دیا تھا اگر یہی ضد ہے تو ہم انشاء اللہ

امام حسینؑ کو سید الشہداء سمجھنے والے سنی علما کی فہرست
سودا اعظم کے صرف بارہ عالموں کے نام پیش کر کے ہم یہ
ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ امام حسینؑ کو علماء اہل سنت بھی سید
الشہداء سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں۔

نوحؑ اس تنویر سے حیرت زدہ ہو گئے تو مسمار کو خدا نے بزبان فصیح گویا کیا اور میخ نے کہا کہ میں بہترین انبیاء محمدؐ بن عبد اللہ کے نام پر معنون ہوں پس جبریل نازل ہوئے اور حضرت نوحؑ نے جبریل سے کہا کہ اے جبریل یہ میخ کیسی ہے جو میں نے کبھی نہیں دیکھی جبریل نے کہا کہ یہ بہترین اولین و آخرین حضرت محمد بن عبد اللہ کے نام کی ہے اس کو کشتی کی روکار میں داہنی طرف نصب کیجئے پھر حضرت نوحؑ نے دوسری میخ کی طرف ہاتھ بڑھایا وہ بھی چمک اُٹھی اور روشن ہو گئی نوحؑ نے کہا یہ کیسی میخ ہے جبریل نے کہا کہ یہ مسمار پیغمبرؐ کے دینی برادر اور چچا زاد بھائی کی ہے اسکو صدر سفینہ میں کشتی کے بائیں طرف نصب کیجئے پھر تیسری میخ اٹھائی وہ بھی چمکنے لگی اور نور پھیل گیا جبریل نے کہا یہ مسمار فاطمہ زہراؑ کی طرف منسوب ہے اس کو ان کے باپ والی میخ کے پہلو میں نصب کیجئے پھر چوتھی مسمار اٹھائی وہ بھی چمک اُٹھی جبریل نے کہا کہ یہ حسنؑ کی مسمار ہے اس کو ان کے باپ والی میخ کے پہلو میں نصب کیجئے۔ (ثمر ضرب بیدۃ الی مسمار خامس فاشرق وانار و بکى و اظهر النداءة فقال یا جبرئیل ما هذه النداءة فقال هذا مسمار الحسین بن علی سید الشهداء فاسمہ الی جانب مسمار اخیه

قربانی کی اہمیت

صفوة العلماء مولانا سید کلب عابد نقوی رحمت مآب

اس سے اہم تر قربانیاں وہ ہیں جو قوم اور مذہب کی حفاظت کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ وہی قومیں ترقی کرتی ہیں اور دنیا میں عزت و آبرو کی زندگی بسر کرتی ہیں جو قربانی کے لئے تیار ہوں۔ عیش و آرام میں پڑ جانے والے اپنی زندگی کی حفاظت کے لئے عزت و آبرو گنوا دینے والے دنیا میں کامیاب نہیں ہوتے بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ جو موت سے بھاگتے ہیں، موت ان کا پیچھا کرتی ہے۔ اور جو خود موت کے پیچھے دوڑتے ہیں، موت خود ان سے بھاگتی ہے۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ ہمیشہ وہی قومیں ابھرتی رہیں اور بڑھتی رہیں جو قربانیوں کے لئے آمادہ رہیں۔ بالکل ان کی ایسی ہی مثال ہے جیسے درختوں کو چھٹا جاتا ہے تو وہ پھسکتے اور بڑھتے ہیں۔ انسان کے سامنے جیسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں اور جیسی سیرت اس کے پیش نظر رہتی ہے اسی انداز میں اپنے کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاریخ عالم میں عظیم ترین قربانی جس میں اپنی ہر محبوب چیز کو بلند مقصد کے لئے قربان کر دیا ہو، کر بلا کے سوا کوئی نظر نہیں آتی۔ ہمیں اسی لئے ذکر مصائب سید الشہداءؑ اور کر بلا کے واقعات کی یاد قائم کرنے کی طرف ائمہ معصومینؑ نے متوجہ کیا ہے تاکہ ہمارے دلوں میں بھی شوق شہادت اور جذبہ قربانی جاگتا رہے۔ ذکر شہادت حسینؑ ہمارے لئے بقائے دوام اور حیات جاوید کا وسیلہ ہے۔ اس قوم کو بڑی سے بڑی طاقت بھی نہیں مٹا سکتی جس کے سامنے امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کے قربانیوں کی مثال موجود ہو اور وہ یہ کہتے ہوں یا لَیْتَنَّا کُنَّا مَعَكُمْ فَأَفْوَزَ مَعَكُمْ واقعہ کر بلا کے مسلسل تذکروں کا نتیجہ جیتا

(بقیہ صفحہ نمبر ۷۶ پر۔۔۔۔۔)

قرآن مجید میں فرزند ان جناب آدمؑ ہائیل و قائیل کا تذکرہ کرتے ہوئے قربانی کی فضیلت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ اسی کی قربانی قبول کرتا ہے جو متقی و پرہیزگار ہو۔ خداوند عالم کی بارگاہ میں قربانی پیش کرنے کا سلسلہ تو بعد میں قائم رہا لیکن قرآن میں جناب ہائیل کی قربانی کے بعد جس اہم قربانی کا تذکرہ ہے وہ جناب اسمٰعیلؑ کی قربانی ہے۔ یقیناً بوڑھے باپ کا اپنے بیٹے کو رضائے خدا کے لئے اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے پر تیار ہو جانا تاریخ انسانیت میں اہم ترین واقعہ ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جناب ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی نیت میں بھی معاذ اللہ کوئی کھوٹ تھا کہ جناب اسمٰعیلؑ کی قربانی فدیہ کے ذریعہ سے قبول ہوئی اور خود جناب اسمٰعیلؑ ذبح نہ ہوئے۔ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن نے پہلے مثلاً جناب ہائیل کی قربانی کا تذکرہ کیا جس کا سلسلہ جناب ابراہیمؑ تک چلتا رہا۔ ان قربانیوں کا مقصد صرف اللہ کی محبت اور اس محبت کے اظہار کے لئے بارگاہ الہی میں اپنی کسی محبوب ترین چیز کا پیش کر دینا تھا۔ لیکن جناب ابراہیمؑ کے دور سے خداوند عالم قربانی کا انداز بدلنا چاہتا تھا۔ اب وہ طریقہ قربانی پسندیدہ قرار پایا جس میں اللہ کے ساتھ خلوص و محبت کے جذبے کے علاوہ بندگان خدا کو بھی کسی طرح سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ مثلاً وہ قربانی جو ہر سال کروڑوں مسلمان دس ذی الحجہ کو انجام دیتے ہیں اس کے لئے قرآن نے ارشاد فرمایا۔ اَطَعُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ۔ یہ تو وہ قربانیاں ہیں جو انفرادی طور پر پیش کی جاتی ہیں جن کی وجہ سے بعض لوگوں کو وقتی فائدہ ہو جاتا ہے اور کچھ بھوکوں کا پیٹ بھر جاتا ہے۔ لیکن

روزِ عاشورا کے مناظر کی کیفیت

فخر وطن عالیجناب سید کلب مصطفیٰ نقوی ایڈووکیٹ

یہ وہ مناظر ہیں جنہوں نے فطرت کی دُنیا کو بدل کرنی زمین اور
نیا آسمان اور صاحبانِ دل کے لئے ایک نیا میدانِ فکر و نظر پیش
کر دیا تھا۔

مختصر یہ کہ مظالم کی سنگینی اور شیطنت کی شرانگیزی کے
مقابلے میں انسانیت کی بلندی، روحانیت کی پُرکینی اور
معصومیت کی دلکشی کے جو مناظر عاشورا کی دوپہر پیش کرتی ہے
جکوں اور صدیوں کی تاریخِ اجتماعی طور پر بھی نہیں پیش کر سکتی،
اور فرض کیجئے پیش کر بھی سکے تو والہانہ شہادت کا وہ مقصد
سرفروشی اور تائیدِ حق میں وہ گرم جوشی کہاں سے لائے گی۔
شب میں شباب کا رنگ کہاں سے پیدا کرے گی اور اگر یہ بھی
فراہم کر سکی تو بے زبان مجاہد کی پُر عظمت قربانی کہاں سے پیش
کرے گی اور یہی وجہ ہیں کہ روزِ عاشورا کا ہر ”نظارہ“ دامنِ
دل می کشد کہ جا اینجاست کا مصداق ہے۔

کہیں بچپن کا کوئی حبیب ابروؤں پر پٹی باندھ کر جوانی
کے تیور پیدا کرنا چاہتا ہے تو کہیں ایک بوڑھا غلام، بقول خود،
اپنے سیاہ خون کو حق پرست آقا کے نورانی خون میں ملا کر
سرخ روئی حاصل کرنے کا ارادہ ظاہر کر رہا ہے۔

ایک ماں بیٹے کے کٹے ہوئے سر کو میدانِ جنگ کی طرف
پھینک رہی ہے کہ راہِ حق میں جو دے دیا اُسے ہم واپس نہیں
لیا کرتے تو دوسری ماں اپنے بچوں کو عروسِ موت سے ہمکنار
ہونے کے لئے ہتھیاروں سے سجا کر دولہا بنا رہی ہے اور
میدانِ جنگ کی طرف یہ کہہ کر بھیج رہی ہے۔ ”جاؤ جان دے
کر واپس آنا“ ایک طرف جوان بیٹا زخموں سے چور شدتِ

خونِ دل ہے دوامِ رنگینی
غم ہے موجدِ چمن طرازی کا

مائی جانسی

یوں تو خیر و شر کے تصادم، حق و باطل کی دار و گیر اور انسانیت
و شیطنت کی ٹکر کی آوازیں فضائے تاریخ میں گونج رہی ہیں اور
گونجتی رہیں گی۔ کاشانہٴ تاریخ کے جھر و کوں سے بہتیرے
عبرت انگیز مناظر دکھائی دیتے ہیں اور آئندہ بھی دیکھے جاسکیں
گے۔ دامنِ تاریخ خون کے چھینٹوں سے رنگین ہے اور بے
گناہوں کا خون اُس کی رنگینی میں اضافہ کرتا ہی رہے گا۔

لیکن ۱۶ھ (مطابق ۶۸۰ء) کے عاشورا کو اپنے عبرت
زاد حیرت افزا مناظر کی ”دوامِ رنگینی“ اور اپنے اثر و نفوذ کے
اعتبار سے جو خصوصیت اور انفرادیت میں گونجتی ہوئی اذان، وہ
نمازیوں کے اوراد و وظائف وہ تلاوتِ قرآن، وہ راہِ حق میں
غلاموں کا آزادوں پر سبقت لے جانے کا دلولہ، وہ بوڑھوں کا
جوانوں سے باشی جیت لینے کا مردانہ فیصلہ، وہ بچوں کا جوانوں
سے پہلے جان دینے کا حوصلہ، زخموں سے چُور چُور ہو جانے
کے بعد بھی وہ ”قولِ سدید“ کہنے کا طغٹ، عین لڑائی میں وہ
فریضہ نماز بجالانا اور نمازیوں کے لئے فضا کو پُر امن بنانے
کیلئے ساتھیوں کا وہ تیروں کی بوچھاڑ کو سینہ تان کر روک لینا، وہ
نیزوں کا سینوں سے ریلنا، وہ تلوار یوں کے ٹھہر مٹ میں
دھنس جانا وہ تیروں کی سنسنہاٹ میں سکون و وقار سے چلنا وہ
برجھیوں کے پھلوں سے کھیلنا، وہ سقائی، وہ جان نثاری وہ
باحواسی، وہ ثابت قدمی، وہ پامروی وہ بے جگری کہ العظمۃ للہ!

دے رہی ہے۔“

نہ معلوم اس بوڑھے مجاہد کی کمزور آوازِ استغاثہ میں کس غضب کا زور تھا کہ اُس نے بیک وقت دواہلِ دل کو متاثر کیا۔ اس آواز کو سن کر ایک نے تو شدتِ عطش کو بھلا کر اپنے کو جھولے سے گرا دیا اور دوسرے نے غش سے آنکھیں کھول دیں بسترِ بیماری پر کروٹ لی۔ اور فرمایا ”پھوپھی اماں۔ ذرا میری تلوار تو دیجئے۔ پھوپھی نے پوچھا ”بیٹا! تم اس شدتِ تپ میں تلوار کیا کرو گے؟“ بیمار نے جواب دیا ”آپ سنتی ہیں؟ بابا استغاثہ فرما رہے ہیں“ فرمایا خوب سن رہی ہوں۔ لیکن تمہاری منزل جہاد تو کر بلا نہیں، شام ہے۔ اور تمہارا آلہ حرب تو شمشیر آبدار نہیں، طوق خاردار ہے۔

اس آوازِ استغاثہ کے بعد عرصہ کر بلا پر کچھ دیر کے لئے سناٹا چھا گیا۔ جو اسی بوڑھے مجاہد کی اس آواز سے ختم ہوا، اے فضہ! اے زینب! اے اُم کلثوم! اور اے اہل خیمہ! میرا آخری سلام قبول کرو، بوڑھے مجاہد نے عورتوں کو تو یوں رخصت کیا۔ اور بیمار بیٹے سے گویا یہ کہتے ہوئے جہادِ آخر کے لئے چل کھڑے ہوئے۔

ناؤ منجدھا ر میں ہے شورِ تلاطمِ جانو
ناخدا جاتا ہے، گھر جانے بس اور تم جانو
رہوار پاس کھڑا ہے۔ لیکن بدن اس قدر زخمی ہے کہ گھوڑے پر چڑھنا دشوار ہے۔ کون ہے جو سوار کرائے۔ زخموں سے چور مجاہد داہنے دیکھتا ہے، کوئی نہیں۔ بائیں دیکھتا ہے، کوئی نہیں پردہ دار لیکن نباضِ فطرت بہن نے ضرورت و مصلحتِ وقت کا احساس کیا زینبؓ نے چادر اوڑھی سراپردہٴ عفت و طہارت سرکا۔ بہن نے آکر رکاب تھامی اور بھائی کو جہاد کے لئے رخصت کر دیا!!

ادھر اس شجاعت کے دھنی مجاہد نے میدان کا رخ کیا ادھر اہل دل کو فضا میں مختلف قسم کی آوازیں گونجتی ہوئی سنائی دیں۔

عطش سے بے تاب ہو کر باپ سے پانی مانگ رہا ہے۔ تو دوسری طرف کم سن بھتیجا مرنے کی رضا۔ لیکن بورھے مجاہد کو نہ اُس پر قدرت ہے اور نہ اس کی تاب!! چشمِ نظارہ ششدر ہے کہ کس منظر کو دیکھے۔ کس کو نظر انداز کر دے۔ اور عقل حیران ہے کہ کس روداد کو بلند کہے اور کس کو پست۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ فوجِ مخالف کے ایک حریت پسند سردار کے کھلے بندوں حسینی قافلے کی طرف شجاعانہ انداز میں بڑھے چلے آنے کا منظر زیادہ نظر فروز تھا یا کسی باوفا کا اُس آنے والے کو ٹوکنے کا جذبہ۔ عاشورا کا وہ منظر زیادہ ہمت افزا تھا جب ایک مجسمہ شجاعت آقا اپنے غلام سے پوچھ رہا تھا کہ کیا ارادہ ہے؟ یا وہ منظر جب ایک مجسمہ وفا بھائی اپنے چھوٹے بھائیوں سے یہ کہہ کر راہِ حق میں لڑنے مرنے کی خواہش کرتا تھا۔ کہ تمہارے تو بیوی بچے بھی نہیں ہیں، یا اُسی مجاہد کے خیمے سے برآمد ہونے کا وہ منظر کہ گویا اقتدارِ اسلام کا خود سر پر ہے اور ملکیت کو کچلنے والی کفش پاؤں میں۔ وفا کی زرہ بر میں ہے اور امیدوں سے بھری ہوئی بھتیجی کی خالی مشک دوش پر، جبل اللہ بشکلِ لجامِ فرس ہاتھ میں ہے۔ اور اسلام کے روشن ماضی اور روشن مستقبل کا پرچم پہلو میں، انسانیت کے مٹانے والوں کو فی النار کرنے اور آقا کے دشمنوں کے دلوں کو پرو لینے والا نیزہ کنوٹیوں کے بیچ میں، اور شعاعِ مہر کو ماند کر دینے والا نورِ پیشانی میں۔ اور یہ سب سمجھ میں آ بھی جائے تو یہ کیسے سمجھ میں آئے کہ جو ان مردوں کی لاشوں پر لاشیں اٹھالانے کے بیسوں منظر زیادہ صبر آزما تھے یا کسی شش ماہ کی لاش کو سینے سے لگا کر خیمے کی طرف بڑھنے اور پھر پلٹنے کا وہ ایک منظر یا عاشورے کی عصر کا وہ منظر جب ستاون (۵۷) برس کے سن اور جھکی ہوئی کمر کے باوجود ایک بوڑھا مجاہد تنہا اعلانِ کلمہ حق کر رہا تھا۔ وہ سننے گوشِ دل سے سنئے۔ آج بھی بلندی سے ہَلْ مِنْ تَاغِیِّ یَنْصُرُنَا۔ ہَلْ مِنْ مُّغِیْثٍ یُّغِیْثُنَا کی آواز صاف سنائی

بعد ”قَتِيلَ الْحُسَيْنِ بِكَرْبَلَاءَ وَذُنُجَ الْحُسَيْنِ
بِكَرْبَلَاءَ“ کی آوازیں فضا میں پھیل گئیں، اہل حرم کے دل
ملنے لگے!!

شاید یہ صدائیں کانوں میں مدتوں گونجا کرتیں اگر شہداء کی
لاشوں کو پامال کرنے والے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازوں نے
انہیں دبانہ دیا ہوتا۔ لیکن ابھی ظالموں کے ترکش کے سب تیر خیم
نہیں ہوئے تھے۔ آہ! خیام میں آتش زنی، زیوروں کا لوٹنا،
چادروں کا چھیننا، دُڑوں کا لگانا، طمانچوں کا مارنا شروع ہوا۔ پھر
جب کوئی ٹوکنے والا بھی نہ ہو تو ظلم و جور کی حد کہاں!۔

جب تک بس چلا ایک جلتے ہوئے خیمے کے بعد دوسرے خیمے
میں عورتوں اور بچوں نے پناہ لی اور جب نوبت آخری خیمے کی
بھی آگئی تو بیمار بھتیجے کے پاس غمزہ پھوپھی نے جا کر پوچھا،
بیٹا! کیا حکم ہے؟ جل کر مرجائیں یا خیمے سے باہر نکل جائیں،
امام وقت نے فرمایا ”پھوپھی جان! یہ آتش زنی در بدری کا
پیش خیمہ ہے بالوں سے منہ چھپائیے اور جانوں کو ہلاکت سے
بچائیے“

اب تو اپنے حامیوں کی جدائی سے دل برشتہ پیمیاں اور
ظالموں کے طمانچوں کی زخم خوردہ پیمیاں خیمے سے باہر نکل آنے
پر مجبور تھیں فضا ان کے شیون و شین سے گونج رہی تھی اور جلے
ہوئے خیموں کے پاس غریب الوطن بیواؤں اور یتیموں کی
آہوں کے دھوئیں اُٹھ رہے تھے اس عالم میں کہ:

نہ بینی ہیج بر سر خازنان گنج عصمت را
مگردر خار و بن باتار و پیود طیللساں بینی
ہمانا سیلِ آتش بردہ بُنگاہ غریباں را
کہ ہر جا پارہ ای از رخت و موجی از دُخاں بینی
(غالب دہلوی)



(ماخوذ از ماہنامہ رضا کار، لاہور سید شہداء نمبر ۹۶، صفحہ ۴۶ تا ۴۸)

بوڑھے مجاہد کے کانوں میں ”يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ
ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً“ کی صدا آنے
لگی۔ اور بہن نے اَقَادُ ذَلِيلًا کی آواز سنی انہیں
آوازوں میں ملا جلا ایک دلدوز بین بھی سنائی دیا۔ ”میرے
لال دکھیا ماں تیری ہمت و استقلال کے ثار“

دوپہر کی دھوپ سر پر گزر جانے، ساتھیوں اور عزیزوں کا
غم اُٹھانے، با وفا بھائی کی جدائی سے کمر ٹوٹ جانے جوان
بیٹے کے ساتھ آنکھوں کی بصارت چلی جانے کے بعد بھی
بھوکے پیاسے مجاہد میں بھلا جنگ کرنے کا حوصلہ اور نبرد آزمائی
کا دلولہ کیا ہوگا۔ لیکن کربلا کا ذرہ ذرہ اور نہر فرات کا قطرہ قطرہ
گواہ ہے کہ جب یہ غمزہ اور بھوکا پیاسا مجاہد تلوار لے کر حملہ آور
ہوا و جرات کے اس مظاہرے کو اپنے دامن میں ابد الابد تک
کیلئے محفوظ کر لیا۔

ستم شعاروں نے الامان و الحفیظ کی آوازیں بلند کرنا شروع
کردیں۔ تو شریف النفس مجاہد کو رحم آگیا اور تلوار میدان میں رکھ
لی لیکن ادھر ظلم نے زور پکڑا تیروں، تلواروں اور نیزوں کا مینہ
برسنے لگا اور بوڑھا مجاہد سیکڑوں زخم کھا کر زمین پر گر پڑا۔ اس
زخمی کی طرف ایک شقی خنجر بکف میدان سے چلا اور ایک ننھا
کسمن بچہ ماں کے ہاتھوں سے دامن چھڑا کر خیمے سے دوڑا۔
قریب پہنچ کر لاکارا ”خبردار! جو میرے چچا کو قتل کیا کھینچتی ہوئی
تلوار ننھے بچے کے اُٹھے ہوئے ہاتھوں پر پڑی، ہاتھ جھول
گئے۔ اور بچہ چچا کی گود میں آ رہا، چچا نے بھتیجے کو سینے سے لگایا۔
منہ پر منہ رکھا اور ابھی شجاعت و شفقت کا یہ منظر ادھورا ہی تھا کہ
ایک تیر نے چچا کی گود میں اُس بچے کا کام تمام کر دیا۔ بوڑھے
مجاہد نے بھتیجے کے تارِ نفس کو ٹوٹتے دیکھا مگر رشتہ صبر کو ٹوٹنے نہ
دیا۔ اس عاشق جان باز نے اپنا خون آلود چہرہ آسمان کی طرف
بلند کر کے خدا کو گواہ قرار دیا اور پھر زخمی پیشانی کو گرم زمین پر
رکھ کر ہنگامِ عصر آخری سجدہ شکر ادا کیا اور بس اسی سجدے کے

عشرہ محرم اور ملی تنظیم

فخر قوم خان بہادر مولوی سید کلب عباس نقوی، جنرل سکریٹری آل انڈیا شیعہ کانفرنس

تنظیم کی داغ بیل ڈالو۔

عشرہ محرم یادگار شہادت حسینؑ ہے۔ رسولؐ کے بھرے گھر کی بربادی اسی عشرہ میں ہوئی ہے مگر خلق اللہ کے لئے پیام حیات نو ہے۔ شہدائے کربلا کا جزبہ قربانی، ان کی قوتِ عمل، ان کے قول و عمل کی ہم آہنگی، ان کی باہم دگر یگانگت اور ان کا حسن تنظیم ان کے تذکروں میں بھی تاثیر۔ ایثار و عمل و اتحاد و مواسات و تنظیم پیدا کرتے ہیں اور یہ تاثیر بوئے گل کی طرح ساری ملت میں پھیل جاتی ہے اور سارے صحنِ ملت کو معطر کر دیتی ہے۔ یہ ذاتی صلاحیت پر اور استعداد قبول پر منحصر ہے کہ کون اس سے کس قدر استفادہ کرے۔

برہمہ عالم ہمی تابید سہیل
جایی ابنان می کند جایی ادیم!
مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جو استفادہ ہم کو اس قدرتی عشرہ عمل و تنظیم سے حاصل کرنا چاہئے وہ ہم حاصل نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس عشرہ کے فیوض تعداد یا مقدار میں کم ہو گئے ہیں بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ ہم میں استفادہ کی اہلیت کی کمی ہے۔

ہم اس اہم مذہبی اور تاریخی واقعہ کے فلسفہ مقصد، عنوان کار اور نتیجہ کار پر غور نہیں کرتے۔ ہم اس یکتائے روزگار قربانی کے تذکرے کو ایسے قصہ کی طرح سنتے ہیں جس کو کوئی قصہ گو ہمارے سنانے کے لئے کہہ رہا ہو۔ ہم اس عشرے میں رسمیات کی ادائی تو بڑے انہماک سے کرتے ہیں لیکن واجبات کی ادائی کی طرف سے غافل ہو جاتے ہیں۔ ہم اس

دورِ حاضرہ کا ایک مجرب طریقہ کاریہ ہے کہ جب کسی کام کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں یا کسی تحریک میں زور پیدا کرنا منظور ہوتا ہے تو اُس کے لئے ایک مخصوص ہفتہ یا دن مقرر کر کے اس کام کے لئے اُسے مخصوص کر دیتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس دن یا زمانہ کی تخصیص اس کام کو بالتخصیص مرکز توجہ بنا دیتی ہے اور اس کا مخصوص چرچا فراموش کار افراد کو بھی اس کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ تخصیص قوت عمل کو بڑھا دیتی ہے اور مدت محدود دائرہ عمل کو تعمیل کے ساتھ وسیع کر دیتی ہے۔ کیونکہ وقت معینہ کے اندر نصب العین سے قریب ہونا یا اس تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔

عشرہ محرم عزائے سید الشہداء کی توسیع، ترقی اور اشاعت کا قدرتی عشرہ ہے۔ اس کے لئے کسی سابق اعلان یا اشتہار کی ضرورت نہیں۔ ہلال ماہ محرم اس کا اشتہار ہے اور عید قربان اس کا پیش خیمہ ہے۔ حضرت اسمعیل کے فدیہ راہ خدا ہونے کا واقعہ حسینؑ کے فدیہ امت ہونے سے صدیوں پہلے کا ہے لیکن ۱۰ ذی الحجہ اور ۱۰ محرم کی قربت دونوں قربانیوں کے نظریوں کو ذہن میں ضرور قریب کر دیتی ہے۔ دونوں قربانیوں کا مقصد رضا جوئی حق تھا۔ اور ان دونوں میں عزم راسخ و برحق اور اعلائے کلمہ حق کی نورانی درخشندگی نظر آتی ہے۔ مگر ایک کا خاتمہ خوشی پر ہوتا ہے اور دوسرے کا غم پر۔ عید قربان پکارتی آتی ہے کہ عشرہ ماتم کا انتظام کرو۔ سال ختم ہے۔

اپنے سال بھر کے اعمال کا جائزہ لو اور جو تقصیرات ہوئی ہیں ان کی تلافی کی کوشش کرو۔ اور آئندہ عشرہ محرم میں اپنی

عشرے میں معاشرتی تقریبات میں شرکت کرتے ہیں۔ نذریں کھاتے ہیں۔ لنگر تقسیم کرتے ہیں لیکن جس یادگار کے سلسلہ میں ایسا کرتے ہیں اس کے افادی پہلوؤں کو بھول جاتے ہیں۔ ہماری مجالس و محافل اپنوں ہی تک محدود رہتی ہیں۔ دوسروں کو ہم ان میں دعوت شرکت نہیں دیتے اور ان کو اپنا شریک عمل نہیں بناتے۔ ہماری نذروں میں خلوص نہیں ہوتا نمود و نمائش کا پہلو زیادہ ہوتا ہے۔ فاقہ کش اور بھوکے پیاسوں کی یادگار میں جو نذریں ہوں، ان میں غربا و مسکین اور محتاج و نادار کا حصہ زیادہ ہونا چاہیئے۔ مگر ہماری نذروں میں چن چن کے مخصوصین بلائے جاتے ہیں۔

لنگر کی تقسیم میں عمومیت ضرور ہوتی ہے مگر تقسیم شکم پُری کے لئے تو ضرور سود مند ہوتی ہے لیکن کھانا پانے والوں کے لئے کوئی اخلاقی تربیت کا سامان فراہم نہیں ہوتا۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ یہ سب چیزیں کچھ بھی افادیت نہیں رکھتیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ نسبتاً ان کی افادیت کم ہے اور عنوان کار بدلنے سے بڑھائی جاسکتی ہے۔

عشرہ محرم میں تنظیم کا موقع کثرت اجتماع کی وجہ سے سب سے زیادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کربلا کے مسافر کے صدقے میں دور دراز کے پردیسی اپنے گھر آ جاتے ہیں۔ یہ سب مخصوص محرم کرنے آتے ہیں۔ اتحاد مقصد اور ملنے جلنے کے مواقع کی زیادتی جو مجالس عزا کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے تبادلہ خیال پر قدرتاً منحصر ہوتی ہے۔ اور باہر کے آنے جانے والوں کے تجربوں سے مستفید ہونے کا موقع مقامی لوگوں کو حاصل ہو جاتا ہے۔ جو تذکرے سید الشہداء اور حسینی قافلہ کے ایثار، عزم، واستقلال، مودت، محبت، ہم آہنگی اور تنظیم کے ان ایام میں ہوتے ہیں، ان کی وجہ سے ایمانی اور روحانی جذبات اور اخلاقی اقدار متحرک ہو جاتے ہیں اور قوت عمل اور جذبہ ایمان کو ابھار دیتے ہیں۔ ان تذکروں کے اخلاقی پہلو تائید حق

تبلغ حق، تشنec حق، ایثار نفس ایقاع نفس، اقباض نفس، رفاقت، اطاعت، شجاعت، جماعتی نظم و ترتیب، جماعتی تنظیم، جماعتی یکرنگی، جماعتی ہم آہنگی، اتحاد مقصد، اتحاد عمل، اتحاد فناء پیش نظر آ کر محرمیوں میں ایک اسپرٹ ڈی کور (جماعتی سنگٹھن) کی لہر دوڑا دیتے ہیں۔ اس لئے یہ ایام جماعتی تنظیم کے لئے بے حد مفید ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ان ایام میں مجالس عزا کے انعقاد، جلوس ہائے عزا کے پروگرام اور دیگر مراسم عزا کی انجام دہی کی وجہ سے انفرادی اور اجتماعی مشغولیت بہت ہوتی ہے مگر ان ہی مشغولیوں کو تنظیمی کاموں میں لایا جاسکتا ہے اور ان ایام کی خداداد برکتوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ مجالس عزا میں ہمارے واعظین و ذاکرین تذکرہ شہادت کے مختلف سبق آموز اور اخلاق بیض موضوعات پر بیان فرما کر ہم کو اپنے اخلاقی فرائض جو ماں باپ، اعزا اور اقربا، مساکین اور فقراء، ایام اور غریب، ہمسایہ اور ہم قریہ، کے متعلق ہیں یاد دل سکتے ہیں اور اس طرح پر خیر و خیرات کی طرف انفرادی توجہ مبذول کر سکتے ہیں۔ اسکے علاوہ انہیں مجالس میں اپنے معابد و مساجد، اوقاف و ادارات، درس و تدریس کا سالانہ جائزہ لے سکتے ہیں کہ وہ کس حالت میں ہیں۔

کیوں ایسی حالت میں ہیں۔ ان کی اصلاح و ترقی کے لئے ہم کو کیا کرنا چاہیئے۔ کیا کیا فروگزاشتیں ان کے متعلق پچھلے دور میں ہوئی ہیں اور کیونکر ان کی تلافی اس سال ممکن ہے۔ اگر عشرہ محرم میں ایسا ہو تو جو شکستہ حالی ہمارے امام باڑوں کی اور جو ویرانی ہماری مسجدوں کی منظر شہود پر آتی ہے اور ضیق وقت کی وجہ سے ناقابل اصلاح ہو جاتی ہے۔ وہ ایک ایسے پروگرام کے تحت میں جو پچھلے سال مرتب ہو چکا ہو، پہلے سے دور ہو سکتی ہے اور ہم اپنے معابد و مساجد کو اچھی اور آباد حالت میں پاسکتے ہیں۔

۱۔ قدیم اور پرانے معابد اور مساجد جو امتداد زمانہ سے شکستہ ہو گئے ہیں ان کے تحفظ و بقا کی کیا صورت نکالی جائے۔
۲۔ جن معابد و مساجد کے لئے کوئی مستقل وقف یا ذریعہ آمدنی نہیں ہے ان کے لئے ذریعہ آمدنی کیسے پیدا کیا جائے۔

۳۔ اپنے مفلوک الحال بھائیوں کی اقتصادی حالت کی درستی کا کیا انتظام کیا جائے۔ کوئی مشترکہ امدادی فنڈ کھول کر ضروری قیود کے ساتھ ان کی امداد کا یا امداد باہمی کے اصول پر نئی تجارت یا روزگار کرنے کا کوئی انتظام ممکن ہے کہ نہیں۔
۴۔ نادار ہونہار اور مستحق طلبہ کی تعلیم کا کیا انتظام کیا جائے۔ آیا ہر فرد کا سب کو اس کام میں ایک جڑ قومی بچوں کی تعلیم کے لئے دینا چاہیئے کہ نہیں۔

۵۔ اپنے بچوں کو مذہبی معلومات سے واقف رکھنے کے لئے ہم کو ان کی ابتدائی تعلیم دینیات کا کوئی انتظام کرنا چاہیئے کہ نہیں۔

۶۔ اپنی زبان کے بقا و ترقی کے لئے ہم کو کیا ذرائع اختیار کرنا چاہئیں۔

۷۔ جو جمہوری اور مرکزی ضروریات ساری ملت کی ہیں اور جن سے ہمارا وقار قومی وابستہ ہے ان میں ہماری کیا پیشکش ہونا چاہئے۔ عشرہ محرم میں ہم کو اپنی مردم شماری کرنے اور مقامی تاریخ مرتب کرنے کا بھی بہترین موقع ملتا ہے اور سال بسال اس کی اصلاح و ترمیم بھی انہیں ایام میں ہو سکتی ہے۔ صرف ایک مرتبہ زیادہ محنت کرنی پڑیگی پھر محض ہر سال ڈھانچہ پر کاغذ بدلنا پڑیگا۔

آئیے ہم عشرہ محرم کو اپنی تنظیم کا ذریعہ بنائیں اور اپنے تئیں سدھاریں۔

(ماخوذ از رضا کار لاہور، سید الشہداء نمبر)



جہاں تک جلوس عزاکا تعلق ہے میرا تجربہ ہے کہ ان کے متعلق بھی جو رسمیں عین وقت پر پیدا ہوتی ہیں اگر ان کا تدارک سال گذشتہ کے تجربات کی بنا پر اسی عشرہ کے مرتب کردہ کسی پروگرام سے کر دیا جائے تو ان خرابیوں کا انسداد ہو جائے۔ ہمارے جلوس وقت سے نہیں نکلتے۔ ایک دوسرے سے ان کا تصادم ہوتا ہے یا ایک حصہ مخصوص تک ہمارے گشت بارونق رہتے ہیں اور ہمارے ماتمی دستے اور شرکا صرف انہیں حصوں تک اپنا انہماک دکھلاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا زور ختم ہو جاتا ہے، یہ خرابیاں دور ہو جائیں۔ جو تقسیم تبرک کی یا فاتحہ و نذر کے کھانوں کی یا لنگر کی ہوتی ہے اسی تقسیم کا ایک جزو قلیل نکال کر ایام و عجز کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگایا جا سکتا ہے بعض مقاموں پر اس مقصد کے لئے صرف ایک حصہ کا نکالے جانے سے اور اس کے محاصل فروخت کرنے سے کافی رقم جمع ہو جاتی ہے۔

کم از کم ایسے حصہ کا نکالا جانا صاحب مجلس کو تو اس طبقہ کی محتاجی کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اور اس کا فروخت ہونا دوسروں کے جذبہ ایثار و کرم کو ہمیز لگا دیتا ہے۔

سب سے بڑا کام جو ہم عشرہ محرم میں اپنی تنظیم کا کر سکتے ہیں یہ ہے کہ ہم محرم میں اپنے یہاں کی تمام قومی اور ملّی ضرورتوں کو اپنے حسینی گروہ کے سامنے لا سکتے ہیں اور ان کی توجہ ان میں سے کسی ایک مخصوص اہم کام کی طرف مبذول کر کے ایک ایک سالہ منصوبہ اس کے تکمیل کا بنا سکتے ہیں اور اس طرح سال بہ سال تدریجاً اپنی قومی ضرورتوں کو پورا کر کے ان کی فہرست کو مختصر کر سکتے ہیں اور دوسرے سال گویا کہ سالانہ حسینی کانفرنس میں اس پر تبصرہ کر کے اپنی کمزوریوں یا کمیوں کو معلوم کر سکتے ہیں اور ان کے تدارک کی تدبیریں نکال سکتے ہیں۔ ایسی مقامی اور عالمگیر ضرورتیں ہر مقام پر تقریباً حسب ذیل قسم کی ہیں۔

صحیفہ کربلا کا ایک ورق

غروبِ آفتاب کے بعد

حسینی شاعر سید ظفر عباس نقوی فضل اجتہادی

وہ میر کارواں جس نے اپنے قافلے کی تباہی صرف اس لئے منظور کہ تھی کی شفاعت کے سفینے کی ناخدائی کرے، ایک نشیب میں حیات ابدی حاصل کر کے استراحت دائمی میں مصروف ہے۔

اب وہ شعلے کہاں، جو بھڑک کر مختصر سے خیموں کو خاک کر چکے ہیں۔ وہ رونق کہاں، جو گھر والوں کے دم سے تھی۔ وہ آبادی کہاں، وہ چہل پہل کہاں، وہ تسبیحوں کی صدائیں کہاں، وہ نعروں کے ہمہ کہاں، جن کو موت کے بیدرد ہاتھ کچل چکے ہیں۔ جو بارہ گھنٹے گزر جانے کے بعد لباس ہستی کو حیات جاوداں سے بدل چکے ہیں۔

خزاں بہ دوش ہواؤں کا عمل، اُداسیوں کا دور دورہ تباہیوں کا قبضہ، بربادیوں کی حکومت، پریشانیوں کا ہجوم، زبانوں پر اب بھی پیاس کی خشکی، حلق میں اب بھی پیاس کے کانٹے، دلوں میں اُمیدوں کی جگہ داغ تمناؤں کے بدلے افسردگی، آرزوں کی منزل پر بے پناہ صدمات کا ہجوم۔

نرم فرش کے بجائے جلی ہوئی قناتوں کی خاک، جلے ہوئے خیموں میں بجھی ہوئی آگ کی گرمی، بھیاںک رات اندھیری فضا میں۔ دشت کا سناٹا، قتل کی ہیبت، کانپتے ہوئے ہاتھوں میں سہمے ہوئے بچے، تھکے ہوئے ہاتھوں میں گردش کرتی ہوئی تسبیحیں، سوکھے ہوئے آنسو، بیٹھی ہوئی آوازیں، دن بھر دھڑکنے کے بعد دلوں کی سست رفتاری۔

اب تو شاید آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ دسویں محرم کا

جس دن کا سورج خون بھری شعاعوں میں ابھر کر نکلا ہو، دن بھر سنسناتے ہوئے تیروں کی گھٹاؤں، چمکتی ہوئی تلواروں کی کاٹ، لچکتے ہوئے نیزوں کی برق فشاں بوریوں کو دیکھتا رہا ہو، اور قتل کی گلزار ریگ پر اپنی شعاعیں بکھیرتا ہوا غروب ہو گیا ہو اُس دن کی شام کیسی ہوگی؟

دریا کے دھارے خاموش، کیونکہ بچہ پیاسا مر گیا۔ کہیں کہیں جھلملاتی ہوئی شمعوں کی روشنی۔ اُداس مظلوموں پر انتہائی ظلم کرنے کے بعد ظالموں پر فطری سکوت طاری، اس لئے کہ صبر کرنے والوں کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

وہ خوب صورت نوجوان جو تلاش حق میں مہینوں کا سفر کر کے موت کی منزل تک پہنچا تھا۔ دل کے گھاؤ پر ہاتھ رکھ کے ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے۔ وہ بھرے بازوؤں والا شیر جس کی پیاس دریا کی کروٹیں لیتی ہوئی موجیں بھی بجھانے میں نا کامیاب رہ چکی ہیں، وہ ساحل پر خواب جاودانی میں مشغول ہے۔

وہ جوانی کی حدوں میں نہ پہنچنے والا حسین نونہال، جو موت کا مزا چکھنے سے پہلے موت کو شہد سے زیادہ شیریں سمجھ رہا تھا۔ آغوش اجل میں حیات جاودانی پسند کر چکا ہے۔ وہ گود میں کھیلنے والا بچہ، جس کو دشمن کی نگاہیں بھی چمکتا ہوا ستارہ سمجھ رہی تھیں، جھولے میں نہیں بلکہ اس چھوٹی سی قبر میں آرام کر رہا ہے جس کا نشان صرف صفحات تاریخ میں ہے یا چاہنے والوں کے دلوں میں ہے۔

سُکھی ہوئی زبان تھی۔

چار سال کی سکینہ مڑجھائے ہوئے پھول کی پتی کی طرح
نڈھال، باپ، چچا، اور بھائیوں کی جدائی سے حزن و ملال دل
شکستہ پھوپھی کے زانو پر سر رکھے رکتی ہوئی نبض کی رفتار کی طرح
بے حال پڑی ہے۔

عباسؑ کی زندگی تک تو یہ امید تھی کہ شاید چچا دریا سے
پانی لا دیں۔ مگر اب تو وہ تمنا بھی خاک میں مل چکی ہے۔
تاریخ کر بلا کے منتشر اوراق اگر جمع بھی کر لئے جائیں
جب بھی بعض ذاکرین سے تضرع و رُحٰن لیجئے کہ زوجہ حراہلیتؑ
کے لئے کھانا اور کچھ پانی لے کر آئی تھی۔ مگر آج تک معتبر
روایات سے اس کا پتہ ہی نہیں چلا کہ بھوکے اور پیاسے اہل
بیتؑ کو کب اور کس تاریخ کو کھانا پانی نصیب ہوا۔

عاشور کا دن گزرنے کے بعد رات ہی کے کسی حصے میں
کھانا پانی ملا تھا یا کوفے کے قید خانے میں پہنچنے کے بعد۔
انہیں بے پناہ مصائب کی وجہ سے دنیا کا ہر مذہب اور
ہر شخص یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ واقعہ کر بلا کی ہر مصیبت اتنی عظیم
اور وزنی ہے کہ جس کی نظیر اور مثال دنیا کی تاریخ آدمؑ سے اس
وقت تک پیش کرنے سے قاصر ہے۔

(ماخوذ از ہفت روزہ نظارہ لکھنؤ، الفضل العباسؑ نمبر، مجرم نمبر ۱۳۹۸ء مطابق ۷-۱۹ اگست ۲۰۱۷ء)



دن اُس کر بلا کے جنگل میں ختم ہو چکا ہے۔ جس کو کم از کم تیس
ہزار یزیدی فوجوں نے گھیر رکھا ہے۔ ارمٰنوں کے لاشے نکل
چکے ہیں۔ مُرادوں کی میتیں زخموں سے چور ہو کر پڑی ہوئی
ہیں۔ نہ اب کوئی دردِ دل کہنے والا ہے نہ حالات کو دیکھ کر رُو
دینے والا۔

آسمان کے ستارے خون میں ڈوبی ہوئی سُرخ قندیلوں
سے دھیمی دھیمی روشنی پھینک رہے ہیں۔ چاند نے دسویں تاریخ
گہن کی گود میں جا کر نظامِ عالم درہم و برہم کر دیا ہے۔ زلزلے
کر بلا کو مسلسل جھٹکے دے کر گزر چکے ہیں۔ آندھیوں کی سیاہی
کالی رات میں ڈوب چکی ہے۔

دریا کے اضطراب اور موجوں کے ہیجان کے بعد سکون
بتا رہا ہے کہ وفادار بھائی ساحل پر خواب جاوداں کو دل سے
پسند کر چکا ہے۔ نہ اب بھتیجی کے لئے پانی کی تمنا ہے نہ بھائی
کے چہرے پر آخری نگاہ کرنے کی حسرت۔

اگر کسی گھر میں ایک موت ہو جاتی ہے تو مہینوں آنسوؤں
کی روانی اور اُلجھتی سسکیوں پر قابو حاصل نہیں ہوتا۔ مگر کر بلا
نے تو حسینؑ کا سارا گھر لوٹ لیا۔ بوڑھے تو بوڑھے جوان بھی نہ
بچ سکے۔ انتہا یہ ہے کہ حسنؑ کا چاند قاسمؑ اور عبداللہؑ جیسے ستارے
بھی ڈوب گئے۔ موت نے اُس چھ مہینے کے سپاہی کو بھی چھین
لیا۔ جس کا حربہ ”ہلکی مسکراہٹ“ اور جس کی تلوار پیاس میں

Mohd. Alim

Proprietor

Nukkar Printing & Binding Centre

26-Shareef Manzil, J. M. Road,

Husainabad, Lucknow-3

0522-2253371, 09839713371

e-mail: nukkar.printers@gmail.com

التماس ترحیم

مومنین کرام سے گزارش ہے کہ ایک بار سورہ حمد اور تین بار سورہ توحید کی
تلاوت فرما کر جملہ مومنین مرحومین خصوصاً مرزا محمد اکبر ابن مرزا محمد شفیع و
حسن جہاں بنت باقر علی خاں کے ارواح کو ایصال فرمائیں۔

محمد عالم

نکیرپرنٹنگ اینڈ بائڈنگ سینٹر حسین آباد، لکھنؤ

حسینیت زندہ باد

پروفیسر علامہ سید علی محمد نقوی صاحب قبلہ، ڈین آف تھیا لوجی ڈپارٹمنٹ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یہی راز ہے کہ تیرہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی لوح حافظہ انسانی سے یہ واقعہ محو نہ ہو سکا بلکہ نقوش اور گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ اب بھی یادگار منائی جاتی ہے۔ جس کی شان پہلے سے دو چند نظر آرہی ہے۔ یہ یاد رہے کہ یہ واقعہ اپنے حیات میں یادگار منائے جانے کا محتاج نہیں۔ بلکہ انسانیت حصول کمال اور اپنی بقا کی جہت سے اس کے اعادہ کی ضرورت مند ہے۔ تجربہ شاہد ہے۔ کہ یادگار منانے والے کچھ نہیں سے سب کچھ ہو گئے۔ اور منع کرنے والے سب کچھ ہوتے ہوئے نیست و نابود ہو گئے سچ ہے۔

چراغ الہی کا بجھانے والا چراغ کو گل نہیں کر سکتا۔ بلکہ خود جل جھلس کے مرجاتا ہے اور وہ چراغ دن گزرنے پر اور روشن ہوتا جاتا ہے۔ یزید اور یزیدی جس چیز کو دبانا چاہتے تھے آج نہ صرف مسلمان بلکہ عالم کے تمام اقوام اس کے اعلان اور اظہار کو اپنا خیر سمجھتے ہیں۔ اور دنیا پر جب بھی ظلم کی گھنگور گھٹا چھا جاتی ہے۔ اور جب کوئی ستم شعار سر اٹھاتا ہے اور جب کوئی جفا کار سیاہ کاری کے بل بوتے پر اقتدار حاصل کرتا ہے تو اہل دل یک زبان ہو کر پکار اٹھتے ہیں۔ کہ اس وقت حسینؑ کی ضرورت ہے، (لیکن اب حسین کہاں؟) حسینیت ہے۔ اسی کو سپر بنا کر ظلم و جور کے شیطان کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ جس سے کمزور فاتح، شہزور مفتوح بن جاتا ہے۔ یہ ہی واقعہ وہ واقعہ ہے۔ جس سے ارباب دیانت اور ارباب سیاست دونوں برابر کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

سیاست دانوں کو دیکھئے۔ تو یہ ہی کہتے ہیں۔ ہر مہتمم بالشان مقصد میں کامیابی کے لئے حسینؑ کا استقلال چاہیے۔

ابتدائے آفرینش سے تاحال اور نبی آدمؑ کی پیدائش سے اب تک دنیا میں کوئی ایسا دل گزار اور روح فرسا واقعہ رونما نہیں ہوا جیسا حادثہ کربلا کی بے آب و گیاہ تپتی زمین پر ظہور میں آیا۔ بلکہ یوں کہوں باوجود دیرینہ سالی چشم فلک نے ایسا ظلم نہ دیکھا۔ جس کی درندگی خونخوار حیوانات سے گویا سبقت لے گئی (جس نے بزبان حال بتا دیا کہ تیز دانت اور بڑے بڑے ناخنوں والا جانور اتنا خطرناک نہیں جس قدر یہ انسان ہے) اور نہ ایسا مظلوم دیکھا جس کا صبر و تحمل لوح ایجاد پر نقش اول بھی تھا اور آخر بھی۔

بہمیت اور بربریت کی اعلیٰ مثال دیکھنا ہو تو وہاں موجود اور سکون و اطمینان کی بہترین نظیر کی تلاش ہو تو اسی سرزمین سے دستیاب ہوگی۔ ظلم، قساوت اور شقاوت کا گھر یزید اور اس کا لشکر تھا اور مہربانی رقت قلب سعادت حسینؑ اور حسینیوں کے لباس میں جلوہ آرا تھی۔ سرگذشت نینوا وہ ماجری ہے جو اپنی نوعیت اپنی اہمیت اپنے رموز اپنے اثرات کے لحاظ سے خود اپنی مثال ہے۔ یہ ہی وہ واقعہ ہے جس نے انسانی جمود کو جوش اور غفلت کو ہوش سے بدل دیا۔ سوئی ہوئی حمیت کو خواب گراں سے چونکایا۔ گئی ہوئی بات کو پلٹایا۔

یہی وہ واقعہ ہے جس سے اولاد آدمؑ انسانی تکمیل کے واسطے ہر قسم کی نصیحت حاصل کر سکتی ہے۔ اور ہر قسم کا سبق اسی سے ملتا ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس میں اخلاق حسنہ، سخاوت، شجاعت، مروت، صبر و رضا، حکم، سکون، بردباری، کرم، رحم، رقت قلب، عبادت و تقویٰ، شرم و حیا، صدق و صفا، ہمدردی و مہربانی ان میں سے کوئی ایسی چیز نہیں جس کا علمی درس نہ ملتا ہو

اور مذہبی جماعت پر نظر کیجئے تو وہ بھی یہی کہتے ہوئے ملتی ہے ”کمال اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک حسیٹی صبر و سکون سے کام نہ لیا جائے۔“

غرض کارنامہ حسینی ہی وہ کارنامہ ہے۔ جس نے انسانیت کے پیکر مردہ میں روح ہی نہیں پھونکی بلکہ ایسے قوانین بھی بنائے جن پر عمل پیرا ہو کے انسانیت کو دائمی زندگانی کا وہ لباس ملتا ہے جو ابدالاباد اس سے نہیں چھن سکتا۔ تو اب یوں سمجھئے کہ حسینؑ نے ایک قالب بے جان میں فقط روح ہی نہیں دوڑائی۔ بلکہ اس کو حیات جاوید بھی بخشی۔ یہ وہ واقعہ ہے۔ جو اپنی معنویت کے اعتبار پر کچھ ایسا دلکش ہے کہ ہر قوم اور طبقہ کے قافلہ فکر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

ہر ایک نے اپنی اپنی حیثیت کے موافق دماغ آزمائی کی ہے۔ اور بہت کچھ کسی نہ کسی نتیجہ کو پالیا۔ اسی واقعہ نے مظلوم کی جو حوصلہ افزائی فرمائی۔ اور ظالم کی جس طرح کمر ہمت توڑی اپنی مثال آپ ہے۔

میرا دعویٰ ہے اگر کسی ظالم تاجدار کو یہ یقین ہو جائے۔ کہ مجھے حسینی صبر و سکون کا مقابلہ کرنا پڑیگا تو کبھی اس کو ظلم کی ہمت ہی نہ ہو حسینؑ کی بے سروسامانی نے حسینؑ کی مظلومیت کا وہ سکہ بٹھایا ہے۔ ان کی شجاعت کی وہ دھاک بٹھائی ہے۔ کہ یزیدیت سر ہی اس وقت اٹھاتی ہے جب اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ میرا مقابل حسینیت سے خالی ہے۔ اور کبھی دھوکے میں یزیدیت نے سر اُبھارا تو فنا کے گھاٹ اتر کے رہی۔ جب تک انسانی فطرت محسن شناس ہے۔ جب تک وہ ماحول کی مسموم فضا سے زہریلے جراثیم جذب کر کے بیمار نہیں پڑی۔ وہ کمال اور اوصاف حمیدہ سے متصف ہی نہیں بلکہ اس کا مرکز تھے۔ اسی لئے انسان حسینؑ کی قدر کرتے ہیں۔ اور تشنہ کربلا کی عظیم شخصیت کو ہرگز فراموش نہیں کرتے۔ زید و عمر کا تذکرہ نہیں نظر والے انسان کا ذکر ہے۔ وہ تو حسینؑ کو بھلا ہی نہیں سکتا۔ اس

لئے انسانیت حسینؑ کی قدر دان ہے۔ لہذا جس کو انسانیت پیاری ہے۔ اس کو حسینؑ ضرور عزیز ہوں گے۔ حسینؑ کو اس وقت فراموش کیا جاسکتا ہے جب لبریز جام فنا نوش جان کرنے کا ارادہ مصمم ہو جائے۔ اور یہ دشوار ہے۔ لہذا حسینؑ سے محبت ہی ناگزیر ہے۔ بلکہ میری آنکھیں تو یہ دیکھ رہی ہیں کہ آج حسینؑ نہیں۔ نام حسینؑ کی محبت دل کی گہرائیوں میں جلوہ ریز ہے۔ تاکہ اس کی بقا کے لئے ایک جم غفیر اپنے آپ کو آغوش اجل میں دینے کے لئے تیار رہے۔

کربلا کے مظلوم! دیکھو تمہاری بیکسی نے تمہارے کتنے جانثار پیدا کر دیئے۔ جن کا وجود قیامت تک رہے گا۔ اے دنیاۓ انسانیت کے پیارے حسینؑ! انسانیت کبھی تمہارے احسانات سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ تم نے انسانیت کے ساتھ جب کے اس کے چہرہ پر مردنی چھا چکی تھی۔ اور اس کی نبضیں ڈوب چکی تھیں۔ وہ مسیحائی کی کہ اس کی رگوں میں خون تازہ دوڑنے لگا۔ اور تھمتے ہوئے قلب میں نئی حرکت پیدا ہو گئی۔ فنا شدہ نقوش انسانیت پھر سے ابھرے۔ یہ کشتی کب کی ڈوب جاتی۔ اگر تم ناخدائی نہ کرتے۔ انسانیت کا بیڑا پار لگانا اور ساحل مراد تک پہنچانا تمہارا کام تھا۔ اس کے نابود ہو جانے میں کیا رہ گیا تھا۔ اگر تم دستگیری نہ کرتے۔ لہذا اے حسینؑ! جب تک انسانیت میں رُمق ہے۔ تمہاری شکر گزار رہے گی۔ اور جب تک دنیا میں انسان موجود ہے اور اس کے پہلو میں دل ہے۔ دل میں حسینؑ کی تڑپ رہے گی۔

ایک معصوم جلوہ قلب میں اور ایک پیارا نام زبان پر رہے گا۔ فرزند رسول! یہ اس لئے نہیں کہ اس سے آپ کو کچھ فائدہ ہوگا بلکہ صرف اس لئے کہ انسانیت کی بقا کا راز اسی میں مضمر ہے کہ آپ ایسے محسن اعظم کو فراموش نہ کرے۔ حسینؑ! انسانیت آپ کو کیوں کر بھلائے؟ جس کے سخت سے سخت وقت میں آپ نے اس کو اور اس کے ساتھ حسن سلوک کو نہ

بھلایا۔ مال، دولت، عزت و ناموس اہل و عیال، عیش و حیات، آل اولاد، دلی مسرتیں اور گھر بار سب اس کی اصلاح کے لئے ایک ایک کر کے قربان کر دیئے۔ پھر بھی اگر انسانیت آپ کو بھول جائے تو یاد کس کو رکھے۔

یہ معلوم ہے کہ انسان اپنی ترقی میں نمونہ اور مثال فطرتاً ڈھونڈتا ہے۔ جس میدان میں اس کو کسی کے نقش قدم نہیں ملتے وہاں قدم رکھتے ہوئے اس کا دل ڈرتا ہے اور جسم میں کچکی ہوتی ہے۔ اگر جانے کا قصد کرتا بھی ہے تو زندگانی سے مایوس اور انجام سے بے خبر ہو کے، لیکن جب کوئی مثال مل جاتی ہے اور کسی کا میاب مسافر کا نقش قدم سامنے آ جاتا ہے تو دل کو ڈھارس ہوتی ہے۔ اور طبیعت اطمینان کے ساتھ مصروف کار رہتی ہے۔ حوصلہ میں بلندی اور دل میں قوت جلوہ ریز رہتی ہے۔ اگر امام حسینؑ یہ اعلیٰ مثال قائم نہ کر جاتے تو کون آگے بڑھتا اور ترقی سے دو چار ہوتا۔ یہ ماننا کہ اور کوئی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا مگر یہ خیال تو ضرور ہی آئے گا کہ کر بلا والے تو اتنا کچھ کر گئے۔ کچھ نہ کچھ تو ہم کو کرنا ہی چاہیے۔

کارنامہ حسینؑ کے ہر پہلو پر اس قلیل فرصت میں روشنی ڈالنا یقیناً میرے لیے ناممکن ہے۔ آئیے اس وقت صرف اسی پر قناعت کریں۔ کہ اس واقعہ سے عبد و معبود، خالق و مخلوق کے تعلقات پر کیا روشنی پڑتی ہے۔ اس مطلب کی وضاحت کے لئے جتنے واقعات ہیں (جو تاریخ کے سینے میں محفوظ ہیں) ان سب کو ہی پیش کرنا کافی وقت چاہتا ہے۔ اس لئے فی الحال شب عاشور کے مختصر تذکرے سے استدلال کروں گا۔ جس سے اہل دل اندازہ فرمائیں گے کہ اس سانحہ میں کتنی معنویت تھی۔ اور حسینؑ شخصیت کتنی ارفع اور اعلیٰ تھی۔ اور یہ بھی ملاحظہ فرمائیں گے کہ خلاق آشنا بندوں کا رشتہ عبودیت کتنا مستحکم ہے جس کو دنیا کی کوئی شے کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی۔ آہ عصرِ نهم محرم کا وقت کتنا پر ہول ہو گا جب یزید لعین کی آہن پوش فوج ٹڈی دل کی طرح

ادھر امنڈ رہی تھی۔ جدھر شاہ کم سپاہ سو سے کم ساتھیوں کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ ایسے بے یار و مدگار پر ہجوم کا حملہ تاریخ میں اپنی آپ مثال ہے۔ اس ہوشربا یورش اور حسرتناک ہنگامہ میں اگر اس مختصر سی جماعت کے حواس میں اختلال اور قدموں میں لغزش خیالات میں تبدیلی ارادوں میں تغیر رونما ہوتا تو بشریت کی نگاہیں ہرگز شرمندہ نہ ہوتیں اور دنیا کا کوئی انسان ان کے غری انقلاب کو برا نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ جو یہی مجبوری ظاہر کرتے عذر باور نہ سمجھی جاتی۔ ذرا سوچئے تو اگر سو آدمیوں کی ایک چھوٹی جماعت ہزار سپاہیوں کے نزعہ میں آجائے تو ان پر کیا گزری ہوگی مگر یہ لوگ ہزاروں جانسان دشمنوں میں گھر جانے کے باوجود بے سرو سامان ہونے کے باوجود تشنہ و گرسنہ ہونے کے باوجود۔ اطمینان، سکون، استقلال اور جرأت کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ کیا مجال جو پریشانی ان کی پیشانی سے آشنا ہوئی ہو۔ کمائیں کڑکنے پر تیار مگر ان کی جبین پر شکن نہیں۔ ادھر تلواریں کھینچ رہی ہیں۔ مگر ان کی نظر نہیں بدلتی۔ یکسوئی میں کوئی فرق نہیں۔

نہایت سکون و استقلال کے ساتھ امام حسینؑ نے اپنے قوت بازو و جناب عباس سے فرمایا، بھیا! ذرا دیکھو تو یہ لوگ کس ارادہ سے آئے ہیں۔ جناب عباس حکم پاتے ہی لشکر مخالف کے پاس آئے۔ ماجرا در یافت کیا۔ پسر سعد نے کہا۔ ”ابن زیاد کا حکم ہے کہ جلد از جلد تمہارا قصہ تمام کیا جائے“ خدا ہی جانے عباسؑ جیسے شیر نے کس ضبط سے کام لیا ہوگا۔ جناب عباسؑ امام حسینؑ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام سرگذشت کہہ سنائی۔

امام حسینؑ نے فرمایا بھائی پھر جاؤ اور ان سے ایک رات کی مہلت مانگو تا کہ اس آخری شب کو بطیب خاطر اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت میں صبح کر دیں اللہ اکبر۔ زندگی کی آخری گھڑیاں کتنی پر ہول ہوتی ہیں۔ مگر ان آخری گھڑیوں

اور حیات کی آخری سانسوں کی لذت کوئی حسینؑ سے پوچھے۔ تمام مورخین گواہ ہیں کہ وہ رات کسی کام میں نہیں کٹی۔ وہ رات ذکر میں، رکوع میں، قیام میں، قعود میں، تسبیح میں، تہلیل میں، تمہید میں، تکبیر میں، سحر ہوگئی۔ کر بلا کابلہ خیز میدان ان سپاہیوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ دشمنوں میں جنگی تیاریاں تھیں۔ تیرو نیزے درست کیئے جارہے تھے، شمشیر پر دھار رکھی جارہی تھی۔ آلات حرب ایک ایک کر کے سنوارے جارہے تھے۔ جھولیوں میں پتھر جمع کئے جارہے تھے۔ لیکن حسینؑ کی طرف کیا تھا۔ لہم دوی کدوی النحل۔ شہد کی مکھیوں کی پرواز میں جو گونج ہوتی ہے۔ اسی طرح ان تشنہ کاموں کی تسبیح نے کر بلا کی فضا کو ہلادیا تھا۔ وہ آواز آج بھی فنا نہیں ہوئی۔ عالم بالا کی سیر میں مصروف ہے۔ کاش جاذب الصوت آلات اتنے قوی ہو جائیں کہ فضا کی آوازوں کو سمیٹ سکیں تاکہ دنیا ان پیاسوں کی تسبیح اور اس کے لہجے کو اپنے کانوں سے سن کر اندازہ تو لگائے کہ مخلوق پر خالق کا کیا حق ہے۔ اور وہ بندے کس آن بان کے تھے جو صبح قربانی کی خوشی میں رات کو عید کی طرح خوشی سے ایک دوسرے کے گلے ملتا تھا۔ اور مبارکباد دیتا تھا۔ گو ان کی زندگی خطرہ میں تھی، مگر جان آفرین کی یاد نے ان کو بے خوف بنادیا تھا۔ کیا یہ واقعہ ہر مذہب و ملت والے کو پالنے والے کی پیدا کرنے والے کی قدر و منزلت نہیں بتاتا۔ کیا اور اس قسم کی حسینؑ کو ششیں ہر شخص کے لئے مفید ثابت نہیں ہوتیں؟ یہ ہے وہ حسینیت جس پر کائنات کو ناز ہے۔ اور کیوں نہ حسینؑ کا ہر کارنامہ افادیت کی جان ہے۔ اور باعتبار شان و شوکت اپنی مثال آپ ہے۔ اسی بے مثال اور دیگر خوبیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ نمبر ۵۷ کا -----)

مفکر اسلام ڈاکٹر مولانا سید کلب صادق نقوی

آج کا دن عاشور کا دن تھا اور شام، شامِ غریباں ہے۔ اس وقت آپ اپنے گھر میں ہیں۔ آپ کے نیچے فرش ہے، گھر میں روشنی ہے۔ لیکن اسی وقت زینبؓ عرشِ مقام جلے ہوئے خیموں کی راکھ پر سر جھکائے بیٹھی ہے۔ آپ کے چاروں طرف عزیز ہوں گے اور زینبؓ کے چاروں طرف عزیزوں کی لاشیں ہیں۔ آپ کے ارد گرد کچھ بچے بھی ہوں گے۔ کچھ بیدار اور کچھ خوابیدہ۔ زینبؓ کے گرد بھی بچے ہیں تو مگر کچھ بیہوش اور کچھ مُردہ۔ اس عالم میں سوچ رہی ہوگی شہزادی کہ یہی جگہ تھی جہاں کل آبادی تھی آج بربادی ہے۔ کل اصحابِ حسینؑ کی تسبیح و تحلیل کی آوازیں تھیں، آج سناٹا ہے۔ نظر اٹھا اٹھا کر ان جگہوں کو دیکھتی ہوں گی، جہاں کبھی عباسؑ، علی اکبرؑ، قاسمؑ، اور عونؑ و محمدؑ کے خیمے تھے۔ اور شاید آخر میں ادھر بھی نظر ڈال کر ایک آہ سرد بھرتی ہوں گی جہاں کل ایک بے شیر کا گہوارہ تھا۔ اسی کے ساتھ اس کا بھی بار بار خیال آتا ہوگا کہ دیکھیں آنے والا اب کل کا دن کیا دکھاتا ہے۔ پھر شاید بار بار دست دعا بلند کرتی ہوں۔ معبود! جس طرح تو نے آج دین کی حفاظت کے لئے زینبؓ کو ان امتحانی منزلوں سے کامیابی کے ساتھ گزارا ہے یونہی آئندہ بھی ثابت قدم رکھنا۔ اس لئے کہ جہاد حق کی راہ میں آج تک تو میں صرف بھائی کی رفیق تھی مگر اب تو سارا بار میرے دوش پر ہے اور پھر حسینؑ تو تو میدانِ کربلا میں سب کچھ قربان کر کے صرف دین بچانا تھا اور مجھے تو دین بھی بچانا ہے اور بھائی کی آخری یادگار زین العابدینؑ کو بھی۔ زینبؓ کو اسی حالت میں کچھ دیر کے لئے چھوڑ کر آئیے دیکھ لیں کہ کربلا کا یہ خونیں حادثہ ہوا کیوں؟۔ رسول کریمؐ نے اسلام کی

شکل میں جب ایک مکمل نظام عدل و مساوات کی بنیاد رکھی تو آپ کے گرد تین گروہ تھے۔ کچھ تو ایسے تھے جو اسلام کے اعلیٰ اقدار کی تباہی نہ دیکھ سکے، کچھ ایسے تھے جو اس پیغام پر سچے دل سے لبیک کہتے ہوئے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق تعلیمات اسلامی کا نمونہ بن گئے۔ مگر حرص و آرز کے بندوں کا ایک گروہ وہ بھی تھا جو پوری قوت سے، حریصانہ ذہنیت سے اس انقلاب کا مقابلہ کرتا رہا۔ اُسے صرف دولت چاہئے تھی۔ ظلم و ستم درکار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کفر کے چہرے پر اسلام کی نقاب ڈال کر یزید کی سرکردگی میں وہ سب کچھ کرنے پر تیار ہو گیا جو جاہلیت کی تعلیم تھی۔ حسینؑ کربلا میں بس یہی مقصد لے کر آئے تھے کہ اس پر دے کو تارتار کر دیں۔ بہ زور حکومت کرنا اور بہ زور شمشیر دولت حاصل کرنا کفر کا حربہ تھا۔ اور دلوں پر بہ زور کردار حکومت اسلام کا معیار تھا۔ یہی دو نظریئے کربلا میں ٹکرائے۔ کفر اسلام کی بنیاد میں ظلم کی پُرانی شمشیر لے کر آیا تو قربان گاہ حق پر، دوستوں، عزیزوں، بھائیوں، بھتیجیوں یہاں تک کہ شبیہ پیغمبر، علی اکبرؑ کو بھی پیش کر دینے کے بعد حسینؑ علی اصغرؑ کو لے کر میدان کربلا میں آ گئے یہ علی اصغرؑ کی قربانی تھی۔ بلکہ ایک عالم اصغرؑ تھا جس میں فلسفہ شہادت کا پورا عالم اکبر پنہاں تھا۔ بس اب حسینؑ کا خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ بیبیوں کو رخصت کر کے میدان کربلا کا رُخ کیا۔ تلواریں استقبال کو بڑھیں نیزوں نے پہلوؤں کو بوسا دیا۔ تیروں نے پیشانی چومی۔ یہاں تک کہ راکبِ دوش رسولؐ بسم اللہ کہتا ہوا زمین فرس سے زمین کی طرف جھکا۔

(بقیہ صفحہ نمبر ۵۶ پر۔۔۔۔۔)

استقلالِ حسین ابن علیؑ وزینب بنت علیؑ

نجم العلماء مولانا سید علی نقوی صاحب قبلہ

کہ ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج رکھ کر بھی میری زبان بند نہیں کر سکتے کیا کوئی عقلمند انسان مستقل مزاج آدمی معاذ اللہ ایسے انسان کو ضدی کہہ سکتا ہے، نہیں نہیں اس کو ضد اور ہٹ نہ کہنا چاہئے اگر بات پر جبرے رہنے کو ضدی کہا جائے تو پھر مستقل مزاج انسان کو کیا کہا جائے گا۔

بہر حال رسول اکرمؐ نے کوہ گراں باری کی طرح سخت سے سخت مخالف سے مخالف ہواؤں اور طوفانوں کا مقابلہ کیا اور **وَقُولُوا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** کے ایک حرف میں تبدیلی پسند نہ کی۔ ابوطالب کے فرزند حضرت علیؑ جنہوں نے رسولؐ کی آواز پر بلیک کہی اور اپنے بازوؤں کی طاقت کو کبھی بھی اسلام سے عزیز نہ کیا۔ مبلغ اسلام محمد مصطفیٰؐ کی صاحبزادی فاطمہ اور علی ابن ابی طالب کے فرزند حسین ابن علیؑ تھے اور بیٹی زینب بنت علیؑ۔ اس مختصر تعارف سے میرا مقصد یہ نہ تھا کہ حسینؑ و زینبؑ اپنے اپنے ارادوں میں کس قدر پختہ تھے۔

بلند ہمتی بلند حوصلگی مستقل مزاجی

یہ صفات انسان حاصل بھی کرتا ہے اور کچھ نہ کچھ اس کا تعلق خاندان سے بھی ضرور ہے۔ اس لئے مجھ کو تمہید کے طور پر یہ لکھنا پڑا کہ نصر بن کنانہ سے لیکر محمد مصطفیٰؐ اور علی مرتضیٰؑ تک قبیلہ والوں اور خاندان والوں کی مخالفتوں کا کیا عالم تھا اور ان کی طاقت کس قدر تھی مگر مخالف کے مقابل میں کسی کے پائے استقلال میں جنبش نہ ہوئی چنانچہ جب حضرت محمدؐ نے دین اسلام کی تبلیغ کرنا شروع کی جو یقیناً ہاشمی اقتدار کے بڑھنے کا موجب تھی تو اس وقت امیہ کے خیالات کا مالک ابوسفیان موجود تھا لہذا اس نے چاہا کہ محمدؐ کے جلائے ہوئے چراغ کو

قریش، قبیلہ نسی شرافت کے اعتبار سے ”عرب“ میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے اس قبیلہ کو قریش کا لقب نصر بن کنانہ کے زمانہ میں حاصل ہوا۔

نصر و فہر و قسوی اپنے اپنے زمانہ میں انتہائی شرافت و عزت و حشمت کے مالک تھے قصی کے بعد ابن مناف نے خاندانی وقار میں چار چاند لگائے اور کعبہ کی تولیت حاصل کی۔

ابن مناف کے دو فرزند تھے ایک ہاشم دوسرے عبدالمطلب ان دونوں بھائیوں میں ہاشم انتہائی با اثر آدمی تھے امیہ جس کا انتساب عبدالمطلب کی طرف تھا اس نے ہاشم کا مقابلہ کیا اور چاہا کہ عزت کا تاج اور شرافت کا تمغہ ہاشم سے چھین لے لیکن اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکا۔

اس ناکامی کی وجہ سے امیہ کے دل میں ہاشم کی طرف سے بغض و حسد کینہ و عداوت پیدا ہو گئی اور اس روز سے بنی ہاشم اور بنی امیہ کی عداوت و اختلاف کی ابتدا ہوئی۔

لیکن یہ کوئی اصول نہیں کہ جس کو دنیا رسوا کرنا چاہے وہ رسوا ہو ہی جائے بلکہ عزت و عظمت و تخت و تاج عطا کرنے والی کوئی اور ہی ذات ہے چنانچہ بنی امیہ کی مسلسل چھیڑ چھاڑ جنگ اور بنی ہاشم کے خلاف پروپیگنڈہ غرض کہ ان چیزوں نے کوئی اثر نہ کیا اور آبائی عزت کے مالک بلکہ اس سے بڑھ چڑھ کر عظمت کے مالک عبدالمطلب ہوئے۔

عبدالمطلبؑ کے دس بیٹے تھے جن میں سے ایک عبد اللہ دوسرے ابوطالب عبد اللہ کے فرزند محمد مصطفیٰؐ جنہوں نے انتہائی مخالفت کے باوجود اپنے مطمح نظر کو نہ بدلا جن کے ارادوں کو پتھروں کی بارش متزلزل نہ کر سکی۔ جنہوں نے کہہ دیا

جلاتے ہی بجھا دوں ورنہ چراغ ہدایت جلنے کے بعد پروانوں کا ہجوم چراغ کے لئے فانوس بن جائے گا لیکن محمد مصطفیٰ نے اس تصادم کا موقع ہی آنے نہ دیا اور آپ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

مختصر یہ کہ محمدؐ علیؑ بن ابی طالب و حسن مجتبیٰ نے اپنے اپنے زمانہ میں اسلام کی بنیادوں کو مستحکم بنانے کے لئے مناسب اقدام کئے مگر ان حضرات کے ارادوں کی مضبوطی کو کون بیان کر سکتا ہے جنہوں نے اپنے ذاتی مفاد پر اسلام کی بہبودی کو مقدم فرمایا یہ اپنی جگہ مسلم ہے کہ انسان اپنا ارادہ اسی وقت بدل سکتا ہے جب سابقہ نظریہ کسی ذاتی مفاد کو ٹھیس پہنچائے مگر ان معصوم ذاتوں کے لئے وقوع تو درکنار ایسا تصور بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ تو اب ہر ہوش و خرد کا مالک انصاف سے کہہ دے کہ ان آغوشوں اور اس ماحول میں جن بچوں کی تربیت ہوگی وہ کیسے ہوں گے۔

حسینؑ بن علیؑ، زینب بنت علیؑ ان دونوں بزرگواروں نے آنکھ کھولتے ہی اپنے جدِ عالیِ مقدار اور پدرِ بزرگوار کے طور طریقے کا مطالعہ کیا، حسینؑ و زینبؑ نے بچپن ہی میں ہی سنا ہوگا کہ نانا نے فرمایا تھا کہ اگر آفتاب و ماہتاب میرے ہاتھوں میں رکھ دیئے جائیں تو بھی اپنے ارادہ سے باز نہ آؤں گا۔

کیا حسینؑ و زینبؑ نے زمانہ طفلی میں ہی سنا نہ ہوگا کہ ابوسفیان و ابو جہل کے پتھروں کی بارش سے جسمِ رسولؐ دب جاتا تھا مگر کلمہ حق سے انکار نہیں کیا کیا فاطمہؑ نے اپنے بچوں کو باپ کی ہجرت کے واقعات سے آگاہ نہ کیا ہوگا۔

نہیں نہیں فاطمہؑ ایسی حوصلہ مند ماں نے بچوں کے حوصلے بڑھانے کی خاطر ضرور بیان کیا ہوگا۔

تو کیا حسینؑ کو ان واقعات سے زینبؑ کو ان حالات سے آگاہ ہونے کے بعد بس باپ دادا کی مظلومی کا ہی صرف علم ہوا ”نہیں“ بلکہ ابوسفیان اور اس کے ہمنا عربوں کے مظالم کا

علم ہونا بھی قہری شئی ہے۔

لہذا میں تو یہ کہوں گا کہ حسینؑ و زینبؑ مظلوموں کی داستانِ سن سن کر ظالم کے مظالم کے احساس کے ساتھ ساتھ قوت برداشت و جذبہ تحمل پیدا کر رہے تھے۔ سخت و دشوار منزلوں کے سامنے آنے پر قومی مفاد کے پیش نظر اپنے مفاد سے قطع نظر حق کے راستے میں قدم کو لغزش نہ ہونا ثبات و استقلال ہے اور اپنے مفاد کے زیرِ نظر باطل کے راستے میں قدم کو جنبش نہ ہونا یہ ہے ضد اور ہٹ۔ حسینؑ و زینبؑ اور اس کے گھرانے کا بچہ مستقل مزاج اور مستحکم ارادوں کا مالک تھا یزید اور اس کے ہمنا ضدی و ہٹی تھے یاد رکھئے ان کے استقلال میں کبھی بھی تزلزل نہیں پیدا ہوا ہاں ضدی سابقہ مفاد سے کم و بیش پر معاملہ کر لیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کیوں نہ کہوں کہ استقلال میں کسی قسم کی تردید نہیں ہوتی بس ایک نظریہ ایک مقصد اور ایک ارادہ جس کے بدل جانے کا امکان نہیں اور ضد میں تردید ہوا کرتی ہے یعنی یا یہ یا وہ کا امکان ہے۔ چنانچہ حسینؑ کا صرف ایک قول تھا کہ بیعت نہیں کروں گا اور یزید نے والی مدینہ سے کہلا بھیجا کہ حسینؑ بیعت کریں یا پھر ان کا سر قلم کر لیا جائے۔ حسینؑ نے جب یہ فرمایا کہ بیعت نہیں کروں گا تو اس وقت یہ حقیقت ہے کہ ان الفاظ کا صحیح مفہوم دنیا کو معلوم نہ تھا کیونکہ انسانی تخیل کے حدود ان امکانات کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے جہاں تک واقعات کی رفتار بعد کو پہنچ گئی۔

اس ”نہیں“ میں کتنے مصائب و آلام کا مقابلہ پوشیدہ ہے اس کو دنیا کا کوئی فرد تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن امام حسینؑ جس وقت نہیں کی آواز بلند کر رہے تھے تو دل کی گہرائیوں میں اپنی قوت ارادی و برداشت و تحمل کا جائزہ لیکر اور حالات کی نزاکت پر غور کر کے یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ شہداء اپنے امکانات کی آخری منزل تک پہنچ جائیں گے۔ لیکن میرے ارادوں کو نہیں

استقلال سے ٹکرا کر خود واپس چلے گئے اور گویا حسینؑ کی زبان پر
یہ شعر جاری تھا ۔

ان کان دین محمد لم يستقم

الا بقتلی یا سیوف خذ ینی

اگر میرے نانا کا دین برقرار نہیں رہ سکتا جب تک میری
رگ حیات قطع نہ ہو جائے تو اے تلواروں آؤ یہ جسم حاضر ہے۔
امام حسینؑ نے اپنے نظریہ کی تکمیل اس طرح کی کہ اپنے تمام
عزیز و اقارب اہل و عیال و احباب کے ساتھ دشت غربت و
مصائب میں محصور اعدا ہو گئے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے
جگر گوشوں کو بھوک اور پیاس کی شدت میں آہ و فغاں کرتے
دیکھا پھر ان میں سے ایک ایک کی خون آلودہ لاش کو اپنے
ہاتھوں سے اٹھایا یا حتیٰ کہ گل نوشگفتہ طفل شیر خوانی علی اصغرؑ کو
اپنے ہاتھوں پر لائے مگر صبر استقامت میں ایک لمحہ کے لئے
بھی متزلزل نہ ہوئے اعزاء و احباب و انصار شہید ہوئے اس
وقت بھی جب یہ علیؑ کا فرزند میدان میں آیا ہے، تو ابرو پر شکن نہ
تھی فوج عمر سعد کا ایک آدمی کہتا ہے کہ خدا کی قسم کوئی دل شکستہ و
ستم رسیدہ زخم خوردہ جس کی اولاد بھائی اعزہ قتل ہو گئے ہوں
نہیں دیکھا جو حسینؑ سے زیادہ مطمئن مستقل مزاج ثابت قدم
اور باہمت ہو۔ خدا کی قسم میں نے ان کے قبل اور ان کے بعد
بھی ان کے مثل کوئی نہیں دیکھا۔ یہ ہے حسینؑ بن علیؑ جو
استقلال و ثبات و اطمینان کا مجسمہ تھا جس کو کربلا میں دشمن دین
کا خدا نے تین دن بھوکا پیاسا قتل کر دیا۔

زینب بنت علیؑ

بعض مصائب تو ایسے ہیں جن میں یہ بھائی بہن برابر
کے شریک ہیں اگر مدینہ چھوڑنے کا رنج حسینؑ کو تھا تو زینبؑ
بھی اس میں برابر سے شریک تھیں اگر حج نہ کرنے کا صدمہ
حسینؑ کو تھا تو زینبؑ بھی اس میں حصہ دار تھیں سفر کے شداوند
شدت کی گرمی جلتی رگ تپتا ہوا صحرا اس میں حسینؑ اور زینبؑ

بدل سکیں گے۔ جب تک مستقبل کے پردے میں وہ شداوند
پوشیدہ تھے اس وقت تک ہم کو اس ”نہیں“ کے وزن کا تصور بھی
نہ تھا لیکن اب ماضی کے صفحات پر آنے کے بعد ہم کو اس کا
احساس ہوا۔ اب خدا کے واسطے انصاف سے بتائیے جب وہ
ڈراؤنے حالات مستقبل و ماضی کو اس قدر بھیا تک بنادیتے
ہیں کہ انسان سوچ کر لرز جاتا ہے تو جب صفحہ حال پر باری باری
یہ نقوش ابھر رہے تھے کہ وہ منظر کس قدر بھیا تک ہو گا لیکن کیا
کہنا حسینؑ تیرے عزم و استقلال کا کہ جس کو تو نے اپنی آغوش
میں لے لیا وہ بھی تیرے ارادہ و عزم کا آئینہ بن گیا۔ یاد رکھئے
مستقبل ہمیشہ حالات کا تصور کرتا ہے اور ماضی بس ان
حالات کے نقوش چھوڑ جاتا ہے البتہ حال ان خطرناک
حالات سے مقابلہ کا زمانہ ہے جو کم ہمت انسان ہیں وہ بس
مستقبل کے حالات کا تصور کر لیتے ہیں اسی وجہ سے جب
مقابلہ کا وقت آتا ہے تو اکثر فرار کر جاتے ہیں اس کا سبب کیا
ہے یہ کہ ان میں صرف تصور کی طاقت تھی مقابلہ کی ہمت نہیں
لیکن وہ لوگ جو مقابلہ میں کامیاب ہی نہیں بلکہ حال پر چھا
جائیں تو اس کا مقصد یہ ہو گا کہ یہ شداوند مستقبل میں روپوش
تھے لیکن ان کے تصورات ان حدود سے آگے بڑھ چکے تھے
اسی لئے کہا جاتا ہے کہ یزید کے مظالم کی انتہا کربلا میں معلوم
ہو گئی مگر حسینؑ کے صبر و ثبات کی حد معین نہ ہو سکی۔ آپ کے اس
وقت عزم کا اندازہ دشمن کو بھی تھا یا دیکھئے اس وقت کو جب شمر
ابن زیاد کا خط لیکر نوین تاریخ کربلا آیا کہ حسینؑ سے اطاعت کا
اقرار لویا جنگ کرو اور عمر سعد نے خط دیکھ کر اپنی جگہ پر کہہ دیا
کہ حسینؑ اس طرح سے اطاعت نہیں کریں گے وہ اپنے باپ کا
دل اپنے سینہ میں رکھتے ہیں۔ حسینؑ ابن علیؑ تیرا کیا کہنا تو نے
اپنے باپ کے نظریہ کو اجاگر کر دیا اور دشمن نے اپنی محفل میں علیؑ
کے بیعت نہ کرنے کا اقرار کر ہی لیا۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ میدان
جنگ میں ہزاروں مصائب کے سیلاب آئے اور اس کوہ عزم و

برابر کے شریک ہیں کہ بلا پہنچ کر صبح عاشور تک کوئی امتحان حسینؑ کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ زینب کے لئے بھی صبر آزمائیا۔

بس فرق اتنا تھا کہ حسینؑ ایک ذمہ دار حیثیت سے تھے
اور زینبؓ عظمیٰ طور سے تھیں۔

ہاں جنگ کی ابتداء کے بعد بھائی بہن کے امتحان میں ظاہری نظر سے فرق ضرور معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو درحقیقت کوئی فرق نہ ملے گا۔ ان دونوں بھائی بہن میں بچپن ہی سے اس قدر انسیت تھی کہ ایک کا رنج دوسرے کو ملول اور ایک کا صدمہ دوسرے کو غمگین بنادیتا تھا اس لئے موقع شہادت پر یہ کہا ہی نہیں جاسکتا کہ علی اکبر کی شہادت سے حسینؑ کو زیادہ صدمہ ہوا اور زینبؑ کو کم، عون و محمد کے قتل ہو جانے سے زینبؑ زیادہ رنجیدہ تھیں اور حسینؑ کم جیسا کہ حالات بتاتے ہیں بیٹوں کی شہادت کے وقت زینبؑ خیمہ سے باہر نہیں آئیں البتہ بھتیجے کی شہادت کے وقت زینبؑ کا دل بچپن ہو گیا اور خیمہ سے باہر تشریف لے آئیں۔ اب باقی شہداء بنی ہاشم کے لئے جو رشتہ حسینؑ کا تھا وہی تعلق زینبؑ سے تھا عبد اللہ اور قاسم اور جناب عباسؑ اور ان کے بھائی حسینؑ اور زینبؑ دونوں ہی سے ایک رشتہ اور ایک تعلق رکھتے تھے۔ لہذا اگر اس موقع پر حسینؑ کے صبر کا امتحان تھا اور حسینؑ اس میں کامیاب ہوئے اور زینبؑ میں عورت ہونے کی وجہ سے قہری طور سے فطری کمزوری ہونی چاہئے تھی بہ نسبت حسینؑ کے، لیکن کامیابی نے ایسے موقع پر بڑھ کر زینبؑ کے قدم بھی چوم لئے۔ البتہ زینبؑ کا امتحان کچھ حسینؑ سے زیادہ ہی تھا خدا کی قسم اگر حسینؑ ہوتے تو وہ بھی کامیاب ہوتے بلکہ حسینؑ اس سے زیادہ سخت امتحان میں مشغول تھے مگر حسینؑ کے لئے یہ موقع ناممکن سا تھا اس لئے کہ جناب عباسؑ اور ان کے بھائیوں کی خون آلودہ لاشیں حسینؑ ہی اٹھا کر لائے اور زینبؑ نے ماتم کیا لیکن زینبؑ نے اپنے ایک اور بھائی کی گردن کو کند خنجر سے کٹتے دیکھا اور وہ تھے

حسینؑ۔ لہذا اگر اپنی شہادت کے اعتبار سے حسینؑ منفرد تھے تو اس امتحان میں جناب زینبؑ بھی (بھائی کے مقابلہ میں) تنہا تھیں۔ اس موقع پر زینبؑ کے تاثرات کا اندازہ معصومہ کے چند جملوں سے ہوتا ہے کہ آج میرے جد بزرگوار اور رسول خدا کی وفات ہوئی آج میرے باپ علی مرتضیٰؑ دنیا سے گزر گئے۔ آج میری ماں فاطمہ زہراؑ دنیا سے سدھاریں آج میرے بھائی حسنؑ مجتبیٰؑ کی شہادت ہوئی۔ ذبح عظیم کی تکمیل تک حسینؑ کے امتحانات میں زینبؑ برابر کی شریک رہیں لیکن کربلا سے کوفہ، شام اور مدینہ کی واپسی تک بلکہ آخری لمحہ حیات تک کے امتحانات میں منفرد نظر آتی ہیں۔ کیا خیام امامؑ کی غارتگری آتشزدگی معمولی امتحان ہے گیارہویں کی بھیانک رات معمولی رات تھی کیا یزیدی کشتوں کا دفن ہونا امام کی لاش کا قتل میں گرم زمین پر رہنا زینبؑ کے لئے ایک عظیم امتحان کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اہل حرمؑ کی اسیری کوفہ کے سچے ہوئے بازاروں سے گزرنا ہر موقع پر اپنی مظلومی، یکسی بے بسی کا اعلان کرنا کیا زینبؑ کے علاوہ کسی کے سینہ میں یہ دل تھا۔ شام کے دربار میں قیدی بن کر جانا یزید کو دنداں شکن جواب دینا یہ علیؑ کی بیٹی کا کام ہو سکتا ہے۔

میدانِ کربلا میں حسینؑ و انصار کے ہاتھوں میں تلواریں
تھیں اپنے دل کی بھڑاس اعداء کو قتل کر کے نکال رہے تھے
لیکن دربارِ ابنِ زیادہ میں زینبؑ کی بیکی دیکھنے کے قابل ہے
کہ ہر طرف (معاذ اللہ) شہادت کرنے والے ہنس کر طعن
و تشنیع کرنے والے اشقیاء کے علاوہ کوئی نظر نہ آتا تھا ان کے
سامنے وہ جفا کار اشخاص موجود تھے جن کی تلواروں نے جوان
فرزندوں بھائی بھتیجیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا۔

زینب کبریٰؑ کے خصوصیات و حالات کو دیکھتے ہوئے کیا
کسی شخص کو یہ کہنے میں جھجک ہو سکتی ہے کہ آپ نے دربار ابن
(بتّی صفحہ نمبر ۱۶ پر)۔۔۔۔۔

واقعہ کر بلا تاریخ انسانی کا سب سے بڑا حادثہ ہے

چوتھی صدی ہجری کے ایک تاریخی مباحثے کا تجزیہ

علامہ سید مجتبیٰ حسن صاحب قبلہ کامون پوری

مباحثہ

عبید اللہ نے کہا کہ ہم دونوں میں یہ بحث تھی کہ

مسلمانوں پہ سب سے برا وقت کون پڑا۔

۱۔ ہم میں سے ایک کا خیال ہے کہ تاریخ اسلام میں شدید ترین حادثہ ”قتل عثمان“ ہے اس لئے کہ یہ واقعہ فتنوں کی کلید بنا۔

۲۔ ہم میں سے ایک کی رائے یہ ہے کہ سب سے بڑا سانحہ ”قتل حسین ابن علی“ ہے اس لئے کہ اس کے بعد مسلمانوں کو حکومت سے کسی حسن سلوک اور عدل و انصاف کی امید نہیں رہی۔

ثالث نے متفقہ معیار پر فیصلہ کی بنا رکھی

حسین بن علیؑ کا تب نے کہا کہ اس کا فیصلہ بہت آسان ہے اور نہایت واضح ہے۔ اس میں شک کی گنجائش نہیں۔ عبید اللہ نے کہا اسے ذرا تفصیل سے بیان کرو۔ حسین ابن علیؑ نے ایک ایسا معیار واقعہ کی سنگینی و اہمیت کا پیش کیا جس نے انکار کے دہن پہ قفل چڑھا دیا اور گریز کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ کا تب نے کہا اسلام میں وہ سانحہ جسے رسول اللہ عظیم ترین محسوس کریں۔ جو واقعہ خود پیغمبر اسلام کی نگاہ میں عظیم تر ہوگا وہی مسلمانوں کی نظر میں سنگین ہوگا۔ عبید اللہ ہنسے اور کہا کہ خدا تمہارا بھلا کرے۔ اے ابو عبید اللہ جو حق کا ساتھ دے گا وہ عادلانہ فیصلہ کرے گا۔

فیصلہ سننے سے گریز، نزاعی دعویٰ پر اصرار

معیار کے رخ سے دونوں سمجھ گئے کہ ثالث کا فیصلہ کیا۔

چوتھی صدی ہجری کے نہایت مشہور ادیب و مورخ ابو بکر

محمد بن یحییٰ صولی کا تب متوفی ۳۳۵ھ ۱۲۳۶ء نے اپنی کتاب ثمار القلوب فی المضاف والتوب (مطبوعہ مصر ۱۲۳۶ء) میں ایک مناظرہ کی روداد لکھی ہے۔ عبید اللہ بن سلیمان وزیر اور ابن اشنب میں یہ بحث چھڑ گئی کہ تاریخ اسلام میں سب سے بڑا حادثہ کون تھا؟ ابن اشنب حضرت عثمان کے قتل کو سب سے بڑا حادثہ کہتے تھے اور عبید اللہ بن سلیمان کا دعویٰ تھا کہ سب سے بڑا حادثہ امام حسینؑ کی شہادت ہے۔ بحث نے طول کھینچا۔ دونوں اسی خیال پر مصر رہے۔

ثالث کی تجویز

جب بحث کسی نتیجے پر نہ پہنچی تو دونوں میں یہ طے ہوا کہ کوئی ثالث مقرر کر لیا جائے۔ ثالث کا جو فیصلہ ہوگا اس کے دونوں ہی پابند ہوں گے۔ اس مباحثے کے ثالث بن علی کا تب مقرر ہوئے ان کا بیان ہے۔ ایک دن میں عبید اللہ بن سلیمان (وزیر) کے پاس گیا۔ وہاں ابن اشنب اور انکے دادا بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ عبید اللہ بن سلیمان نے جب مجھے آتے ہوئے دیکھا تو کہا، اے ابو عبد اللہ ہم دونوں ایک مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں اور اس پر راضی ہو گئے ہیں کہ جو پہلا شخص ہمارے پاس آئے اسے ثالث بنائیں۔ یہ معلوم کئے بغیر کہ ہم میں سے کس کی کیا رائے ہے تم بے لاگ سناؤ۔

موضوع بحث

ابن اشنب میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ معیار کو مسترد کر دیتے۔ وہ گھبرا گئے اور ثالث کو اتنا بھی موقع نہ دیا کہ وہ اپنی بات کو جاری رکھے۔ ثالث کی پوزیشن خود اختیار کر لی اور کہنے لگے رسول اللہؐ کے لئے سب سے بڑا حادثہ قتل عثمان ہے۔ اگرچہ عثمان کو حسینؑ کے برابر رسول اللہؐ سے قربت نہ تھی لیکن اسلام کے لحاظ سے جناب رسول اللہؐ کی نظر میں عثمان ہی کا سانحہ شدید ہوگا۔

ابن اشنب کو وزیر کی تنبیہ

ابن اشنب نے ایک بری مثال پیش کی۔ ابتدا میں ان کو اختیار تھا کہ وہ ثالث کی تجویز کو قبول نہ کرتے یا معیار کی صحت سے انکار کر دیتے۔ لیکن تمام مراحل کے طے ہونے کے بعد فیصلہ کا انتظار نہیں کیا اور معیار کی اسپرٹ سے سمجھ گئے کہ فیصلہ کیا ہوگا۔ ثالث کی رائے کو نظر انداز کر دیا اور اپنی پہلی رائے پر اصرار کرنے لگے۔ عبید اللہ کو عہد شکنی ناگوار گزری۔ انہوں نے ابن اشنب سے کہا خاموش رہو۔ جب حقیقت تم پہ ثابت ہوگئی تو تم سیدھے راستے سے ہٹ گئے۔

(نثار القلوب، عبدالملک نیشاپوری صولی)

تیرہ سو سال کی رائے عامہ کا فیصلہ

اسلام کے ابتدائی ساڑھے تین سو سال میں مسلمانوں کا بناؤ بگاڑ سب کچھ ایک شکل اختیار کر چکا تھا۔ اسلام کا سب سے بڑا حادثہ کون تھا۔ یہ ایک علمی و تاریخی و دینی سوال تھا۔ تاریخ، معاشرت و اخلاق کی رو سے اس کا حل حسین ابن علیؑ کا تب کے استدلال کی روشنی میں بہت آسان تھا۔ اس سوال نے موقع فراہم کر دیا تھا کہ ساڑھے تین سو سال کی طویل مدت میں مسلمانوں کی زندگی اور ان کے خیالات و افکار کا جائزہ لیا جائے۔ ابو بکر صولی نے ہماری منزل آسان کر دی۔ انہوں نے ایک مباحثہ کو ہم تک پہنچایا۔ جس میں ساڑھے تین سو سال کے اندر جس قدر اہم واقعات پیدا ہوئے ان سے چھانٹ کر

صرف دو واقعات کو منتخب کر لیا گیا۔ اور ان دونوں میں سے کسی ایک کی ترجیح پر بحث کا انجام موقوف ہو گیا۔

بنی امیہ نے امام حسینؑ کی شخصیت اور واقعہ کربلا کے اسباب پر پردہ ڈالنے کی پوری جدوجہد اس وقت کی جب وہ کربلا میں ان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے کے لئے تلواروں پر صیقل کر رہے تھے۔ اس حربہ کو بنی امیہ جمل و صفین میں آزما چکے تھے۔ خون عثمان کے نعرہ کو انہوں نے ایک خاص رنگ دیا تھا۔ اپنی جمعیت میں تنظیم اور جوش پیدا کرنے کے لئے وہ اس نعرہ سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ یزید نے اپنی حکومت میں ولید کو جو پہلا خط لکھا تھا۔ اس میں اپنے باپ کی طرح مسئلہ قتل عثمان کو آلہ کار بنانے کی کوشش کی تھی اور اس تہمت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا تھا۔ خط میں اپنے باپ کی خبر موت درج کرنے کے بعد لکھا تھا۔ خوارزمی ۲۵۶۸ھ نے یہ خط نقل کیا ہے کہ:

”آل ابی تراب خوں ریزی میں بہت جری ہیں۔ میرے باپ نے مجھے ان کے متعلق وصیت کی ہے۔ خدا مظلوم عثمان کا بدلہ ابو تراب کی اولاد سے ابی سفیان کی اولاد کے ذریعہ لے لے گا۔ اس لئے کہ یہ حق کے مددگار اور عدل کے طلبگار ہیں۔ جب میرا خط تم کو ملے تو سب اہل مدینہ سے میرے لئے بیعت لو۔ بنی امیہ کبھی کہتے تھے کہ حسینؑ سے بدرکا قرضہ چکانا ہے۔ اور کبھی کہتے تھے کہ حسینؑ سے خون عثمان کا انتقام لیا جائے گا۔ ابن زیاد نے جب کربلا میں فوجی افسر عمر بن سعد کو خط لکھا کہ امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں پر سختی کی جائے اور ان پر پانی بند کر دیا جائے تو اس خط میں یہ الفاظ بھی تھے کہ حسینؑ اور ان کے اصحاب پر پانی بند کر دو۔ ایک قطرہ پانی نہ پینے پائیں جیسا کہ عثمان کے ساتھ کیا گیا۔ یہ خط مورخ ابو حنیفہ دینوری م ۳۸۱ھ نے بھی اخبار طوال میں نقل کیا ہے۔ عین جنگ میں بھی یہ خیال زبان پر آتا رہا۔ عروہ بن قیس نے حضرت بن قیس سے کہا کہ آپ تو

عثمانی تھے۔ اہلبیت کے عقیدت مند نہ تھے۔ حضرت زہیر نے کہا کہ اس وقت میری موجودگی تمہیں یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ اب میری کیا رائے ہے مزاحم بن حریث نے حضرت نافع بن ہلال کے مقابلے میں کہا تھا ”انا علی دین عثمان“ میں عثمان کے دیں پر ہوں۔

(مقتل الحسین طبری، ماخوذ از تاریخ طبری، ج ۶ ص ۳۲۹)

جب حکومت کی طرف سے شہادت کی خبر مدینہ پہنچی اور سارا مدینہ آہ و فغاں سے پر ہو گیا تو مدینہ کے اموی گورنر عمر بن بصیر نے ہنس کر کہا۔ یہ فریاد اس فریاد کے عوض میں ہے جو قتل عثمان میں بلند ہوئی تھی ۶۶ھ میں یہ نعرہ سنا گیا۔

(مقتل الحسین ابن اثیر۔ ماخوذ از تاریخ کامل ابن اثیر ص ۴۲)

جب حضرت مختار ثقفی کی جماعت قاتلانِ امام حسینؑ سے خونِ امام کا بدلہ لینے کے لئے مقام ”حبانہ“ میں پہنچی ہے تو اس نے کہا ”یا لشارات الحسین“ خون حسینؑ کے انتقام کے لئے اٹھ کھڑے ہو۔ اس کے جواب میں دشمن کے کیمپ میں یزید بن عمر نے یا لشارات عثمان کا نعرہ لگایا۔ بنی امیہ کے زوال کے بعد یہ نعرہ دم توڑ چکا تھا۔ ورنہ ابن اشنب واقعہ قتل عثمان اور واقعہ کربلا میں قتل عثمان کو ترجیح دینے کے بجائے یہ کہہ دیتے کہ واقعہ کربلا خون عثمان کا رد عمل تھا۔ ایک چھوٹی سی جماعت مسلمانوں میں سے ایسی رہی ہے جو واقعہ کربلا کے لامحدود اثرات سے گھبراتی تھی۔ اس کے نشانات کو مٹانے اور اس کی ترقی کو روکنے کے لئے مختلف تدبیریں اختیار کرتی رہی۔ کبھی محرم میں عبداللہ بن زہیر کا جلوس نکالا گیا تاکہ ان کے قتل کو واقعہ کربلا کا ہم پلہ قرار دے کر مسلمانوں کی توجہ اس واقعہ کی انفرادیت سے ہٹا سکیں۔ حضرت عثمان کا قتل یا کوئی دوسرا واقعہ سانحہ کربلا سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ دونوں کے مقاصد اور طریقہ کار اور نتائج بالکل جدا گانہ ہیں۔ امام حسینؑ مرکز فضائل تھے۔ یہ سانحہ مذاہب عالم کی تاریخ میں

اپنی آپ مثال ہے۔ تیرہ سو سال کی طویل مدت میں ہر مذہب و ملت اور قوم کی رائے عامہ نے واقعہ کربلا کی انفرادیت کو تسلیم کر لیا۔ ساتویں صدی ہجری کے مشہور مسیحی مورخ مارکر لیفورس اپنی تاریخ مختصر الدول ص ۱۷۹ میں لکھتے ہیں۔ لوگ عثمان کی چند باتوں سے ناراض ہو گئے۔ وہ اپنے اقارب پر فریفتہ تھے رسول اللہ ﷺ نے حکم بن عاص کو جلا وطن فرمایا تھا۔ عثمان نے اس کو پناہ دی۔ عبداللہ بن خالد کو ۴ لاکھ درہم دے حکومت ہونے کے بعد منبر رسولؐ کے اس عرشہ پہ بیٹھ گئے۔ جس پر رسول اللہ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے۔ ابو بکر ایک اعلیٰ درجہ اور عمر دو درجہ نیچے تھے۔ لوگوں نے ان کی ان باتوں پر اعتراض کیا۔ عثمان نے کہا یہ اللہ کا مال ہے میں جس کو چاہوں دوں گا اور جسے نہ چاہوں گا نہ دوں گا۔ عمار یا سرنے اس تقریر پر اعتراض کیا جس پر بنی امیہ نے ان کو اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ عرب سے بہت غصہ ہوئے۔ اور لوگوں کو اکٹھا کیا۔ مدینہ سے ایک فرسخ دور پر پڑاؤ ڈالا، عثمان کے پاس یہ پیام دے کر کسی کو بھیجا کہ یا تو سیدھے ہو جاؤ، اعتدال سے کام لیا معزول ہو جاؤ۔ عثمان کے خلاف جو لوگ سب سے زیادہ پیش پیش تھے ان میں طلحہ و زبیر اور حضرت عائشہ کا نام خاص طور پر آتا ہے۔ عثمان نے ان لوگوں کو خط لکھا۔ تم لوگوں نے میری جن جن باتوں کو نا پسند کیا۔ میں ان سے توبہ کرتا ہوں۔ لیکن ان لوگوں نے بات قبول نہ کی۔ ۳۰ دن تک ان کو محاصرہ میں رکھا۔ عثمان نے علیؑ کو لکھا کہ کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کے چچا کا بیٹا (خود) قتل کیا جائے اور آپ کا ملک چھین لیا جائے۔ علیؑ نے کہا بخدا مجھے یہ منظور نہیں۔ حسنؑ و حسینؑ کو ان کے دروازے پر حفاظت کے لئے بھیج دیا۔ محمد بن ابی بکر و شخصوں کے ساتھ چھت پھاند کر گھر میں داخل ہوئے۔ ایک نے ان کی گردن پر تلوار ماری۔ اور دوسرے نے انہیں قتل کر دیا۔ مورخ، مارکر لیفورس نے تاریخ میں ایک مختصر کتاب لکھنے کا عہد

مثالیں دے دیا کرتے ہیں۔ لیکن ذرہ کو صحرا اور قطرہ کو دریا سے کیا نسبت۔ جتنے اعلیٰ خیالات دنیا کی مختلف قوموں کے اعلیٰ افسانوں نے اور برآوردہ مسلمانوں نے واقعہ کربلا کے متعلق ظاہر کئے ہیں۔ کسی دوسرے واقعہ کی اس کے پاسنگ بھی قیمت نہیں نکالی گئی۔ بعض دوسرے واقعات فتنہ و تخریب کی آگ بھڑکانے کے لئے ضرور کچھ دنوں زندہ رکھے گئے۔ لیکن تعمیر ملی کے ایوان اور قصر انسانیت کی عمارت میں ان سے ایک اینٹ کی جگہ بھی پر نہیں کی گئی کلام و فلسفہ و اخلاق و تاریخ و سیاست و ادب پر جس وقت واقعہ کربلا اثر انداز ہوا اس کی مثال نہیں ملتی۔

بس تنگ نہ کرنا صح ناداں مجھے اتنا
یا چل کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی
واقعہ کربلا جس عظیم ہستی کی طرف منسوب ہے وہ مرکز فضائل تھے۔ اس لئے ان سے کسی کم درجہ کے انسان کا کوئی فعل اس کے مقابلے میں نہیں لایا جاسکتا۔ خود واقعہ کربلا اپنی افادیت و ہمہ گیری اور عظمت و اہمیت کو تیرہ سو سال کی مدت میں ہر عہد کے بڑے انسان سے منواتا رہا ہے۔ اس واقعے کی یاد نے امام شافعیؒ کی آنکھوں کی نیند اڑادی اور ان کے بال سفید کر دئے۔ ان کے خیال میں واقعہ کربلا سے دنیا میں زلزلہ آگیا اور قریب تھا کہ سخت سے سخت پہاڑ اس غم میں گھٹل جائیں۔ وہ حسینؑ شہید کو بے جرم و گناہ مقتول سمجھتے تھے اور اس شعر میں ان کے جس قدر تیز نشتر چھبے ہوئے ہیں ان سے باطل کی رگ حیات قطع ہو جاتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ کس قدر حیرت ہے کہ رسول خداؐ پر ہر نماز میں درود بھیجا جاتا ہے اور ان کی اولاد کو قتل کیا جاتا ہے۔ امام شافعیؒ نے یہ مضامین جن شعروں میں نظم کئے ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں

تأوب هني والفؤاد كئيب
وأرق عيني والرقاد غريب

کیا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی کتاب میں مسلمانوں کے احساسات کی مختصر سے مختصر فہرست درج کی۔ بیسویں صدی مسیحی کے دو مصری مورخ محمد فخر الدین مرحوم استاد تاریخ دارالعلوم و عمران فرج الجبل اپنی مشترک کتاب تاریخ الضراعتہ (ص ۱۳۵ مطبوعہ ۱۹۲۷ء) میں لکھتے ہیں۔ بہت سے مسلمانوں نے ان کو متمہم قرار دیا کہ یہ اپنے اموی عزیزوں کی جنبہ داری کرتے تھے مادر مفتوحہ ممالک کا ان کو حاکم بنا دیا تھا۔ مصر و عراق کے بہت سے عوام ان کے پاس گئے۔ ان کے ساتھ بعض صحابہ زادے بھی تھے ان کے گھر کا محاصرہ کر لیا گیا اور چھت پھاند کر گھر میں گھس گئے اور قتل کر ڈالا۔

ایک ساتویں صدی ہجری کے مصری مورخ اور دوسرے چودھویں صدی کے مسلم و مسیحی مورخین کی رائے حضرت عثمان کے واقعہ قتل کے اسباب کے متعلق پیش کی گئی۔ تاریخ الضراعتہ کے مولف محمد فخر الدین مرحوم مصر کے ایک عقیدت مند فاضل مسلمان تھے۔ ان دونوں عبارتوں سے حضرت عثمان کے قتل کے اسباب بے نقاب ہو جاتے ہیں اور مزید کسی تبصرے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ حضرت عثمان کے خود غرض حاشیہ نشین ان کی موت کا باعث ہوئے۔ حضرت عثمان کی ناکام سیاست نے ہر طبقہ میں ان کے مخالف پیدا کر دئے نہایت نیک دل، پاکباز و سربرآوردہ مشیروں کے خلوص و صداقت کے فائدہ سے انہوں نے اپنے کو محروم کر رکھا تھا۔ حضرت عثمان کا واقعہ اس وقت اس مصرع کے مطابق زیر نظر ہے۔

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات۔

ورنہ واقعہ کربلا کی سطح اتنی بلند ہے کہ تاریخ انسانی کا کوئی حادثہ بھی اس کے مد مقابل نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ ہلاکت و شہادت، معمولی واردات، عادی موت اور با مقصد موت میں فرق نہیں کر پاتے وہ واقعہ کربلا کے مقابلے میں کبھی کبھی دوا یک

وَمِمَّا نَفَعِي نَوْمِي وَ شَيْبَ لَمْتِي
تَصَارِيفِ أَيَّامٍ لَهْنِ خَطُوبِ

✽

تَزَلْزَلَتِ الدُّنْيَا لَأَلِ مُحَمَّدٍ
وَ كَادَتْ لَهُمْ صَمَّ الْجِبَالِ تَذُوبُ
قَتِيلِ بَلَا جُرْمِ كَأَنَّ قَمِيصَهُ
صَبِغُ بَمَاءِ الْا رَجْوَانِ خَضِيبُ

✽

يُصَلِّي عَلَى الْمَخْتَارِ مِنْ آلِ هَاشِمٍ
وَتَغْزِي نَبُوهُ اَنَّ ذَالْعَجِيبِ

(مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ ص ۷۹)

امام شافعیؒ نے اور دوسرے اشعار میں بھی بعض حلقوں کی اہلیت کے ساتھ بے رخی، بے تعلقی بلکہ علیحدگی پسندی کا ذکر کیا ہے۔

سلطان الہند خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے ایک مصرع میں واقعہ کربلا کی جو قدر و قیمت لگائی گئی ہے اسے پھیلا کر بیان کرنے کے لئے دفتر کے دفتر پر کرنے کی ضرورت ہے۔ کس قدر حاوی اور وسیع دامن مصرع ہے:

حقاً کہ بنائے لا الہ است حسینؑ
بیسویں صدی مسیحی کے مشہور مسلمان فلسفی و شاعر علامہ ڈاکٹر اقبال نے واقعہ کربلا کی ابدی قدروں کو دیکھ لیا ہے۔
مثنوی رموز بے خودی میں فرماتے ہیں:

آن امام عاشقان پور بتول
سرو آزادی زبستان رسولؐ
اللہ اللہ بای بسم اللہ پدر
معنی ذبح عظیم آمد پسر
درمیان امت آن کیوان جناب
ہم چو حرف قل ہواللہ در کتاب

بہر آن شہزادۂ خیر الملل
دوش ختم مرسلین نعم الجمل
موسیٰ و فرعون و شبیرؑ و یزید
این دو قوت از حیات آمد پدید
زندہ حق از قوت شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است
چون خلافت رشتہ از قرآن گسیخت
حریت را زہر اندر کام ریخت
خواست آن سر جلوۂ خیر الامم
چون سحاب قبلہ بر باران ستم
بر زمین کربلا بارید رفت
لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطع استبداد کرد
موج خون او چمن ایجاد کرد
بہر حق در خاک و خون غلطیدہ است
پس بنائے لا الہ گر دیدہ است
مدعایش سلطنت بودے اگر
خود نکر دی با چنین سامان سفر
دشمنان از ریگ صحرا لاتعد
دوستان او بہ یزدا ہم عدد
سر ابراہیم و اسماعیلؑ بود
یعنی آن اجمال را تفصیل بود
تیغ بہر عزت دین است و بس
مقصد او حفظ آئین است و بس
ماسوی اللہ را سلمان بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
خون او تفسیر این اسرار کرد
ملت خوابیدہ را بیدار کرد

تبغ لاچون از میان بیرون کشید
از رگ ارباب باطل خون کشید
نقش الا للہ بر صحرا نوشت
سطر عنوانِ نجات ما نوشت
رمز قرآن از حسین آموختیم
زآتش او شعله ہا اند و ختم
شوکت، شام و فر بغداد رفت
سطوت غرناطہ ہم از یاد رفت
تار مار از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز
ای صبا ای پیک دور افتادگان
اشک ماہر خاکِ پاکِ او رسان

اس نظم سے پورا مقتل الحسین تیار ہو سکتا ہے۔ اور اس کے اسباب و نتائج پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے بلکہ پوری اسلامی تاریخ ایک نئے تصور سے مرتب ہو سکتی ہے۔ جس میں اہلبیتؑ کا وجود پوری اسلامی تاریخ پر چھایا ہوا محسوس ہوگا۔

واقعہ کربلا کے مطالعہ میں ذہن انسانی نے کتنی ترقی کی ہے۔ اس کا اظہار شاعر مشرق علامہ اقبال علیہ الرحمہ کی اس عظیم الشان نظم کے ہر مصرعے بلکہ ہر جملے اور ہر فقرے سے ہوتا ہے۔ تیسری صدی کے وسط میں ابوالقاسم عبید اللہ بن سلیمان متوفی ۲۸۸ھ وزیر خلیفہ معتمد عباسی نے جس مسئلہ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا تھا اور علی ابن الحسینؑ کا تب کے فیصلے نے جس پر مہر تصدیق ثبت کی تھی، ابن اشعث کے انکار و تعصب و تنگدلی و حق پوشی سے وہ خیال مردہ نہ ہو سکا۔ ابوالقاسم کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ ان کا پورا خاندان علم و فضل کا گلستان تھا۔ ان کے باپ سلیمان سرآمد روزگار شخص تھے۔ خلیفہ معتمد عباسی کے وزیر تھے۔ عبید اللہ بھی علم و فضل و سیاست میں یگانہ روزگار تھے۔ (تاریخ الغزوی ابن الفظفی ص ۱۸۷)

عبید اللہ نے جو دعویٰ کیا تھا وہ علم و معرفت و اطلاع و نظر پر مبنی تھا۔ یہ دعویٰ حقیقت کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔ سورج کی کرن کی طرح ذہن میں پھیلتا رہا۔ ساتویں صدی ہجری میں خواجہ معین الدین حسن سنجر (۶۳۳ھ - ۶۳۵ھ) نے اس تصور کو

دین است حسین دین پناہ است حسین
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین
کہہ کر اظہار و اعتراف کی مثال قائم کی۔ پھر بیسویں صدی میں شاعر مشرق نے اس تصور کو پھیلا دیا اور پس بنائے لا الہ گردید است

کہہ کر سلطان الہند غریب نواز خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کے خیال کی تجدید کی اور اپنی مثنوی میں اس موضوع پر اتنے اونچے خیالات کا اظہار کیا کہ اس کی شرح و تفسیر کے لئے ایک ضخیم تالیف کی ضرورت ہوگی۔ شہید کربلا کو امام عاشقاں ”کہا“، سرو آزاد بتان رسولؐ کہا۔ امت مسلمہ میں ان کی وہ حیثیت تجویز کی جو سورہ قل ھو اللہ کی قرآن مجید میں ہے ان کو حق و باطل کی ابدی معرکہ آرا قوتوں میں حق کا مظہر قرار دیا۔ کہا کہ حق شبیرؑ کی قوت سے زندہ ہے۔ کہا کہ امامؑ ہمیشہ کے لئے استبداد کی شہ رگ کو قطع کر گئے۔ بڑی قوت سے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا کہ امامؑ کا مقصد حصول سلطنت تھا۔ امامؑ کو سربراہیم و اسماعیل اور ان کے اجمال کی تفصیل کہا۔ بتایا کہ امامؑ کی شہادت نے ہماری نجات کا انتظام کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کے رموز کی تعلیم ہمیں حسینؑ سے ملتی ہے۔ آخر میں انہوں نے ایک ایسی بات کہہ دی جس سے ابوالقاسم عبید اللہ بن سلیمان وزیر عباسی کی روح بالیدہ ہو گئی ہوگی۔ ابن اشعث کی حق پوشی اور اعتراف حقیقت کے بغل سے انہیں جو تکلیف پہنچی تھی شاعر مشرق کے اس روشن اعتراف پر ان کی روح نے مرجھا کہا ہوگا۔

بے نظیر ہے بلکہ تاریخ انسانی میں بھی ایسی کوئی دوسری مثال نہیں ہے۔ یہی ایک حادثہ ہے جس پر نوع انسانی اشک ریز ہوگی۔ کیا ہندو کسی پر اس طرح روئے۔ کیا عیسائی اپنے کسی شہید پر اس طرح اشکبار ہوئے۔ کیا بدھشت میں ایسی کوئی مثال ہے۔ کیا پارسیوں میں ایسی کوئی قربانی ہے جس کا اس قدر احترام کیا جاتا ہو۔ پرانی تاریخ میں ایسے غمنا کی عمیق اور گہرا سوز واقعہ کر بلا سے مخصوص ہے جسے ہر قوم نے محسوس کیا۔

(بقیہ صفحہ نمبر ۱۰۳ پر۔۔۔۔)

کچھ لوگ مسلمانوں کے کارناموں میں فتوحات کی قیمت بہت لگایا کرتے ہیں لیکن علامہ اقبالؒ نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ تاریخ اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ واقعہ شہادت امام حسینؑ ہے۔ اموی و عباسی اور دوسرے فتوحات اس کے مقابلے میں نہیں لائے جاسکتے۔ آج نہ شام کی حکومت ہے نہ بغداد کی۔ غرناطہ کی یاد تک دل میں نہ رہی۔ لیکن امامؑ کی تکبیر سے آج بھی ہمارا جہاں تازہ ہے اور ہماری زندگی میں بیداری ہے۔ صرف یہی نہیں کہ واقعہ کر بلا تاریخ اسلامی میں

سلام

قائم مہدی نقوی تذبذب نگروری، لکھنؤ

جج کبھے یہاں آ کے، یہاں کبھے بنے ہیں
ہم ماتم سرور کے لئے لائے گئے ہیں
سورج ہیں، غم سبط پیمبرؐ میں اُگے ہیں
حرّ شام کے زندان سے آزاد ہوئے ہیں
شبیرؑ کیلچے سے لگانے کو کھڑے ہیں
یوسفؑ کی قسم مصر کے بازار سے ہیں
لگتا ہے ادھر حضرت عباسؑ کھڑے ہیں
اس واسطے مقتل کی رضا مانگ رہے ہیں
عباسؑ سے نیزوں کے ہنر سیکھے ہوئے ہیں
قرآن کے سوروں کی زباں بول رہے ہیں
روکا تو رکے، شاہ چلے ہیں، تو چلے ہیں
یہ ثانی زہراؑ نے ہمیں تحفے دیئے ہیں
”جس گھر میں علم ہے وہاں عباسؑ بسے ہیں“
شبیرؑ نے شمشیر تلے سجدے کئے ہیں
تا حدِ نظر راہ میں زخموں کے دیئے ہیں
اے بابا! سکینہؑ نے بہت رنج سہے ہیں
اصغرؑ نے تبسم سے عجب وار کئے ہیں
تذبذب کے اشعار اگر اچھے لگے ہیں

یہ ہند ہے، ہر گھر میں عزا خانے سے ہیں
کہنے کو تو دنیا میں بہت آئے گئے ہیں
پلکوں کے کناروں پہ جو یہ اشک رکے ہیں
گر چاہتے ہو نورِ سحر مانگ لو حرّ سے
کس اوج پہ ہے خُرتری قسمت کا ستارا
اکبرؑ کی زیارت کے لئے کرب و بلا میں
جس سمت عزا خانے میں ہے پرچمِ عباسؑ
قاسمؑ کو مزا موت کا کیا ہے، یہ پتہ ہے
زینبؑ کے پسر کیوں نہ کریں رن پہ چڑھائی
یہ ایسا گھرانہ ہے جہاں پیر و جواں سب
کیا شان ہے انصارِ حسین ابن علیؑ کی
تابوتِ علم، تعزیے اور مجلسِ سرورؑ
ویرانیاں اُس گھر کی طرف آ نہیں سکتیں
گر شہؑ سے محبت ہے تو سجدے کرو تم بھی
لو دیتے ہیں سجادؑ کے قدموں کے نشانات
یوں خواب میں بیٹی نے کیئے بین پدر سے
سب اہلِ ستم پھیر کے منہ روتے ہیں اپنا
ہر ایک عزا دار دعاؤں سے نوازے

المیہ کربلا کا قدیم ترین ماخذ مقتل الحسینؑ ضحاک مشرقی

صحابی سید سجادؑ

مفکر و حید مولانا خواجہ محمد لطیف انصاری

تاریخ آل محمدؐ

النَّاسُ فَيَمُوتُ فِي الْأَرْضِ كَذَلِكَ يَصْطَرِبُ اللَّهُ
الْأَمْثَالَ۔ (الرد ۷۱ پ ۸۳ ع ۸)

غرض پھین تو خشک ہو کر غائب ہو جاتا ہے ہاں جو چیز بنی نوع انسان کے لئے نفع بخش ہے۔ اسے قدرت زمین میں روک لیتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ مثالوں کو بیان کرتا ہے واقعہ کربلا کا اتنی شدید مخالفت کے باوجود باقی رہنا اور روز افزوں ترقی کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ واقعہ کربلا بنی نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے بقائے صلح پر فائز کیا ہے۔ واقعہ کربلا کی نشر و اشاعت میں دو چیزیں مضر ہیں ایک غم و رنج، گریہ و بکا جو اثر شہادت حسینؑ ہے اور دوسرے تعمیر کردار و تشکیل سیرت جو مقصد شہادت حسینؑ ہے اور جذبات رنج اور تعمیر کردار کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سیرت کے لئے انسان کو اپنے معبود سے رابطہ کی ضرورت ہے جو مسرت میں نہیں بلکہ غم میں مضر ہے سیرت میں انسانی ہمدردی کی خاص اہمیت ہے، وہ درد کے احساس سے پیدا ہوتی۔ سیرت میں گناہ کا فقدان ضروری ہے۔ مسرت محرک گناہ ہے اور غم قاطع عصیاں۔ اس واقعہ کربلا میں ہدایت حق کا راز مضمّن ہے۔

حسینؑ نام ہے ہر خوبی ہدایت کا۔

واقعہ کربلا سبق آموز ہے۔ واقعہ کربلا استحکام قوت

ارادہ اور عزم و استقلال کا شاہکار ہے:

عزم حسینؑ عزم تھا پروردگار کا۔

آل محمدؐ کی تاریخ نویسی کے متعلق مسلمان مورخوں نے جو بے التفاتی اور بے اعتنائی بلکہ بے تعلقی اختیار کی ہے وہ حیرت انگیز ہی نہیں بلکہ افسوسناک ہے۔ اکثر مورخوں نے یہ حالات لکھنے میں بخل سے کام لیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں تاریخ کی ابتداء بنی امیہ کی تحریک و ترغیب سے ہوئی۔ چونکہ سیاسی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ جنہیں آل محمدؐ سے سخت عداوت تھی ان کی انتہائی کوشش تھی کہ آل محمدؐ کو مٹا دیا جائے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے تین طاقتوں سے کام لیا۔

۱۔ حکومت کی طاقت

۲۔ دولت کی طاقت

۳۔ پریس کی طاقت

حالانکہ کسی فرد یا کسی گروہ کے مٹانے کے لئے ان طاقتوں میں سے ایک طاقت کافی ہو جاتی ہے مگر مخالفین آل محمدؐ کا ان تینوں طاقتوں کے استعمال کے باوجود ذکر آل محمدؐ قائم رہنا اور روز افزوں ترقی کرنا اعجاز ہے۔ المیہ کربلا کو خصوصیت سے ملیا میٹ کرنے کی سعی کی گئی مگر اس المیہ کا دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرنا بتلا رہا ہے کہ اس واقعہ میں بقائے صلح کی صلاحیت موجود ہے۔ قرآن حکیم نے ناموس بقانے صلح پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔

فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا حَايَنَهُ

ستم بڑھے تو قدم راہ حق میں اور بڑھے

حسینؑ نام ہے پر جوش استقامت کا

واقعہ کربلا مذہب و روحانیت کی طاقت کا بہترین مظاہرہ ہے۔ المیہ کربلا حقانیت اسلام کی روشن دلیل ہے۔ یہ اخلاقی اور تمدنی معلومات کا بہترین گلدسہ ہے، جماعتی تنظیم کے لئے بہترین شاہراہ ہے۔ جوش عمل کا محرک ہے۔ عزت نفس کی معراج ہے صبر آموز ہے۔ شجاعت زا ہے۔ ایثار و مواسات کا اسوہ کاملہ ہے۔ حُسن معاشرت کا رہنما ہے۔ مساوات کی یادگار مثال ہے۔ صاف بیانی کی زندہ مثال۔ امن پسندی اور رواداری کی بے نظیر نظیر ہے۔ قربانی کا روشن مینار ہے۔ اگر کسی قوم و ملت کے لئے یہ تمام امور منفعت بخش اور اس کی حفظ و بقا کے کفیل اور اس کی ترقی کے ضامن ہیں۔ تو امت اسلامیہ کو بلا امتیاز فرقہ اس واقعہ کی یادگار قائم رکھنا چاہیئے۔ اور اسے ہم سب مسلمانوں کو اپنا مشترکہ سرمایہ عزت و افتخار سمجھنا چاہیئے۔ اگر ان نازک حالات میں جن میں سے پوری دنیا گزر رہی ہے ان اخلاقی معاشرتی تعلیمات کی ضرورت ہے تو ہمیں المیہ کربلا کی صحیح معنوں میں یادگار منار کی بجائی جہتی، ہم آہنگی، اتحاد و اتفاق کا ثبوت پیش کرنا چاہیئے۔ بد نصیب ہے وہ قوم جو اپنے منفعت بخش واقعہ سے فائدہ نہ اٹھائے۔ واقعہ کربلا کسی خاص فرقہ کا اجارہ یا مناپلی نہیں ہے۔ ابن تیمیہ یا ابن خلدون جیسے مورخوں نے اس واقعہ کے متعلق معاندانہ روش اختیار کر رکھی ہے وہ ایک سیاسی سانس تھا جو ختم ہو گیا، مرزا حیرت کا انکار اس واقعہ کی عالمگیر تاثیرات کو کم نہیں کر سکا۔ اسی طرح خلافت معاویہ و یزید جیسا لٹریچر اس کے صالح اور سلیم تاثرات پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ ہمیں اس المیہ منفعت بخش کے اثرات کو قبول کر کے مذہب و ملت کی خدمات کو باحُسن الوجوہ انجام دینا چاہیئے۔

ہم اس واقعہ کا قدیم ترین ماخذ پیش کر رہے ہیں۔ یہ مقتل ضحاک مشرقی کا ہے۔ جو قبیلہ بنی مشرق کے ایک فرد

تھے۔ یہ قبیلہ مشہور محب اہل بیت قبیلہ ہمدان کی ایک شاخ ہے۔ ضحاک کو ان کے قبیلہ کی نسبت سے مشرقی کہتے ہیں۔ یہ بزرگ امام زین العابدین علی ابن الحسینؑ کے صحابی تھے۔ خود واقعہ کربلا میں موجود تھے اس لئے دوسرے مقاتل کے مقابلہ میں ہم اس مقتل کے متعلق یہی کہہ سکتے ہیں کہ:

شنیدہ کی بود ماندہ دیدہ

یہ واقعہ کربلا میں مشروط طور پر شریک ہوئے تھے انہوں نے امام حسینؑ کے دست مبارک پر بیعت کرنے میں شرط یہ لگا رکھی تھی کہ میں آپ کی مدد اس وقت تک کروں گا جب تک میرا مدد کرنا آپ کے لئے منفعت بخش ہوگا۔ یہ شرط اس لئے تھی کہ مقروض تھے اور قرض کے متعلق امام حسینؑ کا ارشاد ہے۔

کل ذنب یکفرہ القتل فی سبیل اللہ الا
الدین لا کفارة لہ الا اداؤہ، اویقضى صاحبه او
يعقو الذی لہ الحق (۱۸) فردوع کا فی کتاب المعیشہ

”شہادت سے ہر گناہ کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ سو قرض کے اس کا کفارہ صرف اسکی ادائیگی ہے۔ خواہ مدیون ادا کرے یا حق دار ادا کرے۔“ جب ضحاک مشرقی اور مالک بن نضر ارجبی نے یہ صورت پیش کی تو امام نے اسے منظور فرمایا یہ امر بھی ضحاک مشرقی کے معتبر اور متدین اوپابند شریعت ہونے کی دلیل ہے۔ عاشور کے دن ضحاک نے تا امکان دشمن کی فوج سے مقابلہ کیا اور آخر میں امام سے واپسی کی اجازت حاصل کی۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر واپس چلے گئے۔ ضحاک کے اس طرح واپس ہونے پر نہ آئمہ میں سے کسی نے اور نہ علما متقدمین میں سے کسی نے ان پر اعتراض کیا۔ اس صورت حال میں الہی مصلحت کا رفرما ہے اور وہ یہ کہ ضحاک جیسی متدین پابند شریعت مخلص اور باوثوق شخص کی واقعات کربلا پر عینی شہادت ہو۔ ضحاک مشرقی کا بعد واقعات کربلا زندہ رہ کر واقعات کربلا کی اس طرح نشر و اشاعت فرمانا ایک عظیم الشان خدمت ہے جس

جب تک جنگ حضور کے لئے نفع رساں ہوگی اور آپ سے ضرر کو دفع کرے گا۔ میں مقابلہ اور دفاع کرتا رہوں گا۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ تم کو اجازت ہے۔

شب عاشور

میں حضرت کی خدمت میں مقیم رہا۔ جب عاشور کی رات نمودار ہوئی تو حضرت نے اپنے اصحاب و انصار کو جمع کیا اور ان سے فرمایا۔

تم سب کو اجازت ہے۔ رات کی تاریکی حائل ہے تم سب چلے جاؤ۔ تم میں سے ہر ایک میرے اہلبیت میں سے کسی ایک کا ہاتھ پکڑ لے اور اپنے اپنے شہروں اور قریوں میں چلے جائیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کشاکش کی صورت پیدا فرمادے۔ یہ لوگ صرف میرے ہی طلبگار ہیں جب مجھے پالیں گے پھر کسی دوسرے کو تلاش نہیں کریں گے۔

آل عمران کا جواب

اولاد ابو طالب یعنی امام کے بھائیوں بیٹوں، بھتیجوں اور بھانجوں یعنی عبداللہ بن جعفر کے فرزندوں نے عرض کیا۔ ہم ایسا کیوں کریں۔ کیا اس لئے کہ آپ کے بعد بھی زندہ رہیں۔ خدا ہمیں ایسا دن کبھی نہ دکھلائے سب سے پہلے یہ بات عباس و فاشعار نے کہی تھی۔ پھر سب نے اسی طرح اپنا اپنا خیال ظاہر کیا۔ اس پر امام حسینؑ نے فرمایا۔ اے اولاد عقل! تمہارے لئے مسلم کا شہید ہو جانا کافی ہے۔ جاؤ میں نے تمہیں اجازت دے دی۔

اس پر لوگوں نے جواب دیا کہ ہمیں اہل دنیا کیا کہیں گے کہ ہم نے اپنے بزرگ اور سردار اور بہترین چچا کو چھوڑ دیا ان کے ساتھ رہ کر نہ تیر اندازی کی نہ شمشیر زنی کی اور نہ نیزہ زنی۔ خدا کی قسم ہم ایسا نہیں کریں گے بلکہ ہماری جانیں ہمارے اموال اور ہمارے اہل و عیال آپ پر قربان ہو جائیں گے۔ ہم آپ کی رکاب میں جہاد کریں گے جہاں تک کہ اسی

کے لئے منشاء الہی نے اسے زندہ رکھا۔ اب اس مقتل کو پڑھئے اور اس سے سبق حاصل کیجئے جو شہادت حسینؑ کا بلند ترین مقصد اور رفیع ترین نصب العین ہے۔ (محمد لطیف انصاری)

المیہ کر بلا کا قدیم ترین ماخذ مقتل الحسینؑ

ضحاک مشرقی المشاہد کا اردو ترجمہ

ضحاک مشرقی و مالک ارجبی کا ورد کر بلا

ابونخف کہہ گئے ہیں کہ مجھ سے عبداللہ بن عاصم فائشی نے بیان کیا ہے کہ ان سے ضحاک بن عبید اللہ مشرقی نے کہا کہ میں اور مالک بن نصر ارجبی دونوں خدمت امام حسینؑ میں حاضر ہوئے اور ہم نے سلام کیا۔ پھر ہم ان کی خدمت میں بیٹھ گئے۔ آنحضرت نے سلام کا جواب دیا۔ ہمیں خوش آمدید کہا۔ پھر ہمارے آنے کا سبب دریافت کیا۔ ہم نے عرض کیا کہ ہم خدمت اقدس میں سلام کے لئے حاضر ہوئے ہیں اور سرکار احادیث سے آپ کے لئے دعائے خیر مانگنے آئے ہیں۔ آپ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور حضور کو لوگوں کے حالات سے آگاہ کرنے کے لئے بھی حاضر ہوئے ہیں۔ آپ اس پر غور فرمائیں کہ لوگ آپ سے جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ اس پر امام نے فرمایا۔ اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہی ہمارا بہترین وکیل ہے۔

ہم نے چاہا کہ واپس لوٹ جائیں۔ سلام کیا اور حضرت نے ارشاد کیا ہماری مدد کرنے میں کون سا امر مانع ہے؟ مالک بن نصر ارجبی نے عرض کیا۔ میرے ذمہ قرض ہے۔ اور میرے بال بچے ہیں۔ میں نے بھی اسی طرح عرض کیا مجھ پر بھی قرض ہے اور میرے بھی اہل و عیال ہیں لیکن حضور اگر مجھے واپسی کی اجازت دے دیں تو جس وقت تک کوئی لڑنے والا حضور کے ساتھ رہے گا۔ میں اس وقت تک حضور کی طرف سے جنگ کرتا رہوں گا۔

نے بھی ایسی ہی گفتگو کی اور کہا خدا کی قسم! ہم آپ پر فدا نہ ہو جائیں۔ ہم اپنی گردنوں، پیشانیوں اور ہاتھوں سے حضور کا دفاع کریں گے اور جب تک ہم قتل نہ ہو جائیں اور اپنے اس فرض سے عہدہ برآ نہ ہو جائیں۔

(تاریخ طبری جلد ۶ ص ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۳، طبع مصر۔)

شب عاشور کا مشغلہ

امام حسینؑ اور ان کے اصحاب و انصار نے شب عاشور کی ساری رات نماز و استغفار دعا و تضرع، تہلیل و تکبیر، رکوع و سجود میں اسی طرح بسر کی۔

ابو حرب سے مکالمہ

ضحاکؑ نے امام حسینؑ کو یہ آیت پڑھتے سنا اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ ہم نے اس کو مہلت اور فارغ البالی دے رکھی ہے۔ وہ ان کے حق میں بہتر ہے۔ حالانکہ ہم نے مہلت اور فارغ البالی صرف اس وجہ سے دی ہے کہ وہ اور خوب گناہ کریں۔ آخر تو ان کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ منافقو! خدا ایسا نہیں ہے کہ برے بھلے کو تمیز کئے بغیر جس حالت پر تم ہو اسی حالت پر مومنوں کو بھی چھوڑ دے۔ (آل عمران ۸۷ پ ۹۷)

دشمن کے محافظ دستہ میں ایک شخص نے جب یہ آیت سنی تو کہا کعبہ کے رب کی قسم ہے۔ ہم وہ پاگ لوگ ہیں جو تم سے سبقت لے گئے ہیں۔ (طبری جلد ۶ ص ۲۴۰ طبع مصر) ضحاک کہتے ہیں۔ میں نے اسے پہچان لیا اور بریر سے پوچھا آپ اسے جانتے ہیں۔ بریر نے انکار کیا۔ میں نے کہا یہ ابورب سبیعی عبد اللہ بن شہر ہے (جو مسخر ابھی ہے اور بیہودہ اور بہادر و جنگجو بھی ہے) (زمانہ سلطنت جناب امیرؑ میں) اعیان بن قیس ہمدانی جو امیر المومنینؑ کی سپاہ کے ایک سردار تھے) اس کو اس کی حرکتوں کی بنا پر قید کر دیا کرتے تھے۔

بریر نے ابو حرب سے کہا: اے فاسق! کیا تجھے بھی خدا

چشمہ پر اتریں گے جس پر آپ اتریں گے۔ آپ کے بعد زندگی کا خدا بُرا کرے۔

اصحاب و انصار کے معروضات مسلم بن عوسجہؓ

مسلم بن عوسجہ کھڑے ہوئے۔ خدمت امامؑ میں عرض کیا۔

ہم اور آپ کو چھوڑ دیں؟ اور آپ کے حقوق کی ادائیگی میں بارگاہ احدیت میں عذر کا سامان نہ کریں؟ خدا کی قسم یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ جب تک کہ ہم دشمن کے سینہ میں اپنا نیزہ نہ توڑ دیں جب تک تلوار کے قبضہ پر ہمارا ہاتھ ہے تیغ زنی نہ کریں۔ خدا کی قسم ہم آپ سے علیحدہ نہیں ہوں گے اگر میرے پاس جنگی اسلحے نہیں ہوں گے تو حضور کے سامنے میں ان پر پتھر برساتے برساتے جان دے دوں گا۔

سعید بن عبد اللہ حنفیؓ

اس پر سعید بن عبد اللہ حنفیؓ نے عرض کی۔ خدا کی قسم ہم آپ سے علیحدہ نہیں ہوں گے۔ جب تک ہم بارگاہ ایزدی میں اس ذمہ داری سے سبکدوش نہ ہو جائیں جو رسول اللہ کے بعد آپ کی نسبت ہم پر عائد ہوتی ہے۔ خدا کی قسم اگر میں قتل کیا جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں۔ پھر جلا دیا جاؤں اور پھر میری خاک کو منتشر کر دیا جائے اور ایسا سلوک میرے ساتھ ستر بار ہو جب بھی آپ سے میں علیحدہ نہیں ہوں گا۔ یہاں تک کہ مجھے آخری موت آپ کے سامنے آجائے اور میں ثبات قدم کے ساتھ ایسا کیوں نہ کروں جبکہ قتل ہونا صرف ایک ہی بار ہے اور پھر انجام کار ہمیشہ ہمیشہ کی غربت ہے۔

زہیر بن قینؓ

خدا کی قسم اگر میں قتل کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں تو میں اس پر راضی اور مسرور ہوں۔ لیکن آپ اور آپ کے خاندان کے یہ لوگ بچ جائیں۔ ضحاک کا قول لے کہ دوسرے اصحابؓ

پاک و پاکیزہ لوگوں میں شمار کرے گا؟

ابو حرب نے کہا تم کون ہو؟

بریر نے جواب دیا: میں بریر بن خفیر ہوں۔

ابو حرب: انا للہ اے بریر! سخت مشکل ہے بخدا! تم

ہلاک ہوئے۔

بریر: اے ابو حرب کیا تم اپنے گناہان کبیرہ سے توبہ

کرو گے؟ خدا کی قسم ہم پاک اور طیب ہیں اور تم خبیث ہو۔

ابو حرب۔ آپ کا ارشاد درست ہے۔ میں بھی اس کی

تصدیق کرتا ہوں۔

ضحاک: افسوس ہے کیا تجھے میری معرفت کچھ فائدہ نہ

دے گی؟

ابو حرب: میں آپ پر فدا (تمسخر) معرفت سے کام

لوں گا۔ تو یزید بن عذرہ عنزی کی مصاحبت کون کرے گا۔

(یہ یزید بن عذرہ عنزی یزید کی سپاہ کا ایک سردار تھا۔

اس وقت ابو حرب کے ساتھ تھا)

ضحاک: خدا تیرا برا کرے۔ آخر تو بے وقوف ہی تو

ہے۔

بعد ازاں یزید بن عذرہ عنزی ہمارے پاس سے چلا

گیا۔ ایک اور شخص عذرا بن قیس ہماری نگرانی کرتا رہا۔

فوج کی ترتیب

ضحاک کا بیان ہے کہ جب عمر بن سعد نے ہفتہ کے بعد

صبح کی نماز ادا کی تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر آیا اور

میدان میں نکلا امام حسینؑ نے بھی لشکر آرائی فرمائی۔ حضرت

کے باز ۳۲ سوار اور چالیس پیادے تھے۔ حضورؐ نے لشکر کو

اس طرح مرتب کیا۔

زہیر کو فوج کا میمنہ (دایاں حصہ Right Wing)

اور حبیب کو میسرہ (بایاں حصہ Left Wing) سپرد کیا اور

اپنے بھائی عباسؑ کو علمبردار بنایا ان لوگوں نے خیام اہل بیت

کی طرف اپنی پشت کر لی۔ شب عاشور تھوڑی ہی دیر میں
خندق کھود ڈالی۔

لکڑی منگوائی اور اس خندق میں لکڑی بھردی۔ پھر فرمایا

کہ جب لشکر ہم پر یورش کرے گا تو ہم اس خندق میں آگ

روشن کر دیں گے تاکہ کوئی ہماری پشت پر سے نہ آسکے اور دشمن

ہم سے ایک ہی طرف سے جنگ کرے صبح ہوئی تو خندق میں

آگ روشن کر دی۔

شمر بد لگام کا کلام

دشمن نے ہماری طرف پیش قدمی کی تو شعلہ زن آگ

بھڑکتے دیکھی جسے ہم نے اپنی پشت پر روشن کیا تھا تاکہ کوئی

ہمارے پیچھے سے نہ آسکے۔ ناگاہ دشمن کی سپاہ میں سے ایک

شخص نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور چپکے چپکے ہمارے پاس سے

گزرا۔ دیکھا کہ ہمارے خیام کے قریب آگ روشن ہے۔ وہ

واپس ہوا اور بلند آواز سے کہنے لگا۔

اے حسینؑ (معاذ اللہ) آپ نے قیامت سے پہلے دنیا

میں آگ جلائی۔

امامؑ نے فرمایا۔ یہ کون ہے؟ پھر فرمایا ”شاید شمر ہے۔“

لوگوں نے عرض کیا ”ہاں وہی ہے۔“

امامؑ نے فرمایا: ہاں تو دوزخ کی آگ کا زیادہ مستحق

ہے۔

مسلم بن عوسجہؓ نے کہا: یا بن رسول اللہ! میں آپ پر

قربان۔ یہ میری زد میں ہے۔ کیا میں ایک تیر نہ چھوڑ دوں؟ تیر

خطانہ کرے گا۔ کیوں کہ یہ میری زد پر ہے۔ یہ فاسق بہت بڑا

جبار ہے۔

امامؑ نے فرمایا: ہرگز نہیں۔ میں پہل نہیں کروں گا۔

امام علیہ السلام نے گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر یزید کو

نصیحت فرمائی: امامؑ کے ایک گھوڑے کا نام لاحق تھا۔ حضورؐ نے

اپنے بیٹے علی اکبرؑ کو اس پر سوار کیا۔ جب دشمن حضرتؑ کے

آنحضرتؐ کے ایسے فضائل بیان کئے جن سے اللہ آگاہ ہے اور جن کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ خدا کی قسم میں نے اس دن سے پہلے اور اس کے بعد کوئی ایسا فصیح و بلیغ خطیب نہیں دیکھا اور نہ سنا۔ پھر حضرت نے ارشاد فرمایا۔

میرا نام و نسب تو بتاؤ؟ سوچو تو میں کون ہوں؟ پھر اپنے دل میں غور کرو اور اپنی اس زیادتی پر اپنے دل کو ملامت کرو۔ پھر غور کرو۔ کیا تمہارے لئے جائز ہے کہ مجھے قتل کرو یا میری توہین کرو۔ کیا میں تمہارے نبی کا نواسا نہیں ہوں؟ کیا میں رسول اللہؐ کے وصی رسول اللہؐ کے ابن عم اور رسول اللہؐ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور ان کی تصدیق کرنے والے کا فرزند نہیں ہوں؟ کیا حمزہ سید الشہداءؑ میرے باپ کے چچا نہیں؟ کیا جعفر طیارؑ و زبنا حین میرے چچا نہیں۔ کیا یہ مشہور حدیث تمہارے گوش گزار نہیں ہوئی کہ رسول اللہؐ نے میرے اور میرے بھائی کے متعلق فرمایا۔ یہ دونوں جو انسان بہشت کے سرمایہ دار ہیں۔ اگر تم میری بات سچ مان لو تو خیر جو میں کہتا ہوں وہ حق ہے۔ بخدا جب سے مجھے اس امر کا عرفان ہے کہ اللہ تعالیٰ جھوٹوں کو دشمن رکھتا ہے اور جھوٹ جھوٹے کے لئے نقصان رساں ہے میں کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اگر تم میری اس امر میں تصدیق نہیں کرتے تو تم میں وہ لوگ موجود ہیں جن سے تم پوچھو گے تو وہ تمہیں بتلائیں گے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری، ابوسعید خدری، سہل بن سعدی، زید بن ارقم اور مالک بن انس سے پوچھ لو۔ یہ لوگ تمہیں بتادیں گے کہ انہوں نے رسولؐ کو یہ حدیث میرے اور میرے بھائی کے متعلق فرماتے ہوئے سنا ہے۔ کیا رسول اللہؐ کی یہ حدیث بھی تمہیں میرا خون بہانے سے نہیں روک سکتی۔

شمر سے گفتگو

شمر نے یہ تقریر سن کر کہا کہ اگر میری سمجھ میں کچھ آتا ہو کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تو میں ایک حرف پر خدا کی عبادت

قریب ہوئے تو حضرتؐ نے اپنی سواری منگائی۔ سوار ہوئے اور ایسی بلند آواز سے کلام فرمایا جسے سب لوگ سن لیں۔ لوگو! میری بات سنو۔ مجھ پر تمہارا حق ہے۔ جلدی نہ کرو۔ سنو۔ میں نصیحت کرتا ہوں اور تمہیں اپنے آنے کا سبب بتلاتا ہوں۔ اگر تم نے میرے عذر کو تسلیم کر لیا۔ میری تصدیق کی اور مجھ سے انصاف کا سلوک کیا تو یہ تمہاری سعادت ہے تو پھر تمہیں میری مخالفت کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ میری طرف سے اتمام حجت ہو جائے گا۔ اگر تم اصلیت سے بے خبر ہو تو تم آگاہ ہو جاؤ گے اور اگر تم نے میرا عذر تسلیم نہ کیا اور میرے ساتھ عدل و انصاف نہ کیا۔ پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ ”فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمَعُوا أَمْرَكُمْ وَ شُرَكَاءُكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيْكَ وَلَا تَنْظِرُوا“ (یونس ۱۰۷-۱۰۸)

تو تم خود یا جسے تم چاہو اپنا معین کار بنا لو اور پوری جدو جہد سے میری مخالفت کرو اور مجھے مہلت نہ دو۔ میرا بھروسہ تو خدا پر ہے جس نے قرآن نازل کیا۔ وہی صالحین کا مدد و معاون ہے۔

ضحاکؑ کہتے ہیں کہ جب امام کا یہ کلام اہل حرم آپ کی بہنوں اور بیٹیوں نے سنا تو رونے لگیں۔ جب ان کے گریہ و بکا کی آواز بلند ہوئی تو امامؑ نے اپنے بھائی عباسؑ اور اپنے بیٹے علی اکبرؑ کو بھیجا کہ انہیں خاموش کریں اور فرمایا ابھی کیا ہے ابھی تو انہیں بہت رونا ہے۔

ضحاکؑ کہتے ہیں کہ جب یہ دونوں حضرات اہل حرم کو چپ کرانے کے لئے گئے۔

تقریر

جب عورتیں خاموش ہو گئیں تو حضرت نے اللہ کی حمد و ثنا کی اور ایسے صفات بیان کئے جو سرکارِ احدیت کے شایانِ شان ہیں پھر سرکارِ رسالت پر درود بھیجا اور بہت دیر تک

اس پر ان لوگوں نے جواب دیا ہم نے نہیں لکھا۔ امام فرمایا: سبحان اللہ تم نے ضرور لکھا تھا۔ پھر فرمایا: لوگو! جب میرا آنا تمہیں ناگوار ہے تو مجھے جانے دو کہ میں کسی محفوظ جگہ چلا جاؤں۔

قیس بن اشعث (جدہ بنت اشعث کا بھائی) نے کہا کہ کیا آپ اپنے چچا زاد (یزید) کا حکم نہیں مانیں گے؟ اگر آپ نے ایسا کر لیا تو یہ لوگ آپ کی حسب دل خواہش آپ سے سلوک کریں گے اور آپ کو ان سے کچھ تکلیف نہیں پہنچے گی۔

امام نے فرمایا: تو اپنے اسی بھائی (محمد بن اشعث) کا بھائی ہے۔ جس نے مسلم کو قتل کیا۔ کیا تو چاہتا ہے کہ بنی ہاشم تجھ سے مسلم کے خون کے علاوہ کسی اور خون کا مطالبہ کریں؟ بخدا میں ذلت کے ساتھ اپنے آپ کو ان کے حوالے نہ کروں گا اور نہ غلامانہ زندگی کا اپنے لئے اقرار کروں گا۔ پھر اس آیہ مبارک کی تلاوت فرمائی ”(عباد اللہ) اِنِّیْ عُنْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ اَنْ تَرْجُمُوْا۔“ (ذخاں ۲۰ پ ۱۲۵ ع ۱۲)

خدا کے بندو! میں تمہارے اور اپنے خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ تم مجھے سنگسار کر دو۔ پھر سورہ مومن کی اس آیت کی تلاوت فرمائی ”عُنْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِنْ کُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ“ میں ہر متکبر سے جو قیامت کا منکر ہے اپنے اور تمہارے پروردگار کی پناہ لیتا ہوں۔

(تذکرہ خواص الائمہ سبط ابن جوزی ص ۱۲۹)

ضحاک کا واپسی کے لئے اجازت مانگنا

ضحاک کہتا ہے کہ پھر میں نے ناقہ بٹھا دیا اور عقبہ بن سمعان کو حکم دیا کہ اسے باندھ دو۔ عقبہ نے ناقہ باندھا۔

(طبری جلد ۶ ص ۲۴۲ طبع مصر)

پھر فوج نے امام پر یورش کی۔ جب میں نے دیکھا کہ امام کے انصار شہید ہو چکے ہیں اور سعید ابی طاع حثی اور بشیر

کروں (مجھے خدا پر شک ہو) ”شمر کا یہ جملہ آیت قرآن سے مانور ہے۔ وَمِنْ النَّاسِ وَ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰی حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَتْهُ حَیْرٌ اَظْمَآءٌ بِہِ وَاِنْ اَصَابَتْہُ فِتْنَةٌ اَنْقَلَبْ عَلٰی وَجْہِہِ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃُ ذٰلِکَ هُوَ الْخُسْرٰنُ الْمُبِیْنُ“ لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو ایک کنارے پر کھڑے ہو کر خدا کی عبادت کرتے ہیں تو اگر اس کو کوئی فائدہ پہنچ گیا تو اس کی وجہ سے مطمئن ہو گیا۔ اگر اس کو کوئی مصیبت چھو بھی گئی تو فوراً منہ پھیر کر کفر کی طرف پلٹ پڑا۔ اس نے دنیا اور آخرت دونوں کا گھانا اٹھایا۔ یہی تو صریح گھانا ہے۔“

اس پر حبیب ابن مظاہر نے شمر کو مخاطب کر کے کہا تو ستر حرفوں پر خدا کی عبادت کرتا ہے (یعنی تجھے خدا پر شک ہی شک ہے اور میں اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ تو صحیح کہتا ہے کہ امام کی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ میترے دل پر مہر لگ چکی ہے۔

پھر امام حسینؑ نے اپنے کلام کا آغاز فرمایا: اگر تمہیں اس حدیث میں بھی شک ہو تو کیا تم اس میں بھی شک کرتے ہو کہ میں تمہارے نبی کا نواسہ ہوں۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تمہارے لئے میرا قتل کس طرح جائز ہے؟ کیا میں نے کسی کو قتل کیا ہے جو تم اپنے اس مقتول کا عوض لیتے ہو۔ کیا میں نے تمہارا کوئی مال ضائع کیا ہے جس کی تم تلافی چاہتے ہو۔ یا میں نے تمہیں کوئی زخم لگایا ہے جس زخم کا تم قصاص چاہتے ہو؟

سب پر جب خاموشی اور سکتہ کا عالم طاری تھا تو امامؑ نے نام بنام خطاب فرمایا۔

اے شہبث بن ربعی! اے حجار بن الجہر! اے قیس بن اشعث اور اے یزید بن حارث! کیا تم نے مجھے یہ نہیں لکھا تھا کہ پھل پختہ ہیں، کھیتیاں تروتازہ ہیں۔ چشمے لبریز ہیں، آپ کو فوج تیار ملے گی، آپ آئیے؟

مرثیہ

در حال حضرت قاسم ابن حسن علیہما السلام (بند ۲۱۰)

دعبل ہند نواب مولانا سید فرزند حسین نقوی ذاکر اجتہادی

(۱)

جب بار لائی شاخ دل آرزو مری
پھیلی گل مراد سے ہر سمت بو مری
ہے اوس کے گھر سے سوا آبرو مری
مرغانِ باغ کیوں نہ سنیں گفتگو مری
نالوں میں دل نے یوں اثر درد بھر دیا
بلبل کو زمزموں نے مرے بند کر دیا

(۲)

کیا عندلیبِ باغ بھلا ہوگی نغمہ زن
آباد میرے دم سے ہیں دنیا کے سب چمن
میری نسیمِ آہ سے کھلتا ہے یاسمن
اشکوں سے میرے پھولوں کے بھگے ہیں پیرہن
نالوں سے بلبلیں ہیں نخلِ منفعل کی طرح
ہنتے ہیں پھول روز مرے زخمِ دل کی طرح

(۳)

یہ سیلِ آنسوؤں کی ہے نہر چمن نہیں
انگورِ زخمِ قلب ہیں یہ یاسمن نہیں
اشکوں کے قطرے اوس کے دُرِ عدن نہیں
خم شاخِ نخلِ دل ہے یہ تازہ دہن نہیں
ملتی ہے زخمِ قلب سے سرخیِ گلاب کی
حاجت مرے گلوں کو نہیں ہے حجاب کی

(۴)

پھیلی ہوئی تمام جہاں میں ہے ان کی بو
دوشِ نسیمِ باغ پہ پھرتی ہے چار سو
ہر پھول کو پسند ہے آزادی کی خو
رگ رگ میں دوڑتا ہے مرے قلب کا لہو
شرکت جگر کے خون کی بے اشتباہ ہے
گلشن میں سرخیِ گل لالہ گواہ ہے

(۵)

شرکت سے مرے خوں کی دکھتا ہے لالہ زار
ہے نور کا تنقِ مرے گلزار کا غبار
میرے سبب سے ہے چمنِ نظم کی بہار
مرغانِ باغ میں مرے نغموں کی ہے پکار
ان چچھوں نے رنگ اڑایا ہے کیا مرا
بھرتے ہیں طائرانِ چمن زمزمہ مرا

(۶)

نغموں نے مست کر دیا وقتِ سحر مجھے
دکھلا رہا ہے زمزمہ میرا اثر مجھے
گلشن کی ہے صفائی جو مدِ نظر مجھے
اشکوں کا پانی دے رہی ہے چشمِ تر مجھے
ہے زورِ آنسوؤں میں دم فکر اس طرح
منع سے اپنی جائے کبھی سیل جس طرح

(۷)

ہے آنسوؤں سے خاک نشیں اس جگہ غبار
شبِ نیم کی طرح ہیں جو درِ اشکِ آبدار
دامن بڑھا کے لیتا ہے ہر پھول بار بار
ہیں پاک و صاف باغِ مضامین کے برگ و بار
شبِ نیم کی طرح ہم جو سرِ شب سے روئیں ہیں
پتے نہالِ فکر کے اشکوں نے دھوئیں ہیں

(۸)

پھیلا ہے میرے نغمہٴ دلکش کا یہ اثر
ہیں محو سیکھ سیکھ کے شاخوں پہ جانور
دھویا ہوا جو صحنِ چمن سب ہے سر بسر
اک چاندنی سی رات کو آ جاتی ہے نظر
زائل جو دیکھتا ہے یہ رنگِ سیاہ کو
دھوکا ہے اپنے عکس کا گلشن میں ماہ کو

(۹)

گلشن میں ٹھنڈی سانسوں سے ہر شے ہے باغِ باغ
ہیں اس چمن میں پھولِ عنادل کے دل کے داغ
ہر گل کا اونچی شاخ پہ ہے تا فلک دماغ
جلتے ہیں زخمِ قلب کے اس باغ میں چراغ
یاں کون پوچھتا ہے سیاہی کی بات کو
ملتی نہیں جگہ کسی گوشے میں رات کو

(۱۰)

ہوں کیوں نہ اس چمن سے مرے دل کو الفتیں
ہیں ایک طرح پر گل و بلبل کی صحبتیں
دکھلا رہا ہے صانعِ قدرت کی صنعتیں
زائل کئے ہوئے ہے یہ راتوں کی ظلمتیں
تابندگی سدا ہے مرے دل کے داغ کی
رہتی ہے ایک طرح ضیا اس چراغ کی

(۱۱)

بجھنے کا اس کو ڈر ہے نہ جلنے کی ہے ہوس
صرصر سے بھی نہ گل ہو بھرے لاکھ اگر نفس
بلبل مرے چمن کی نہیں قیدیِ قفس
صیاد کی ہوئی ہی نہیں اس پہ دسترس
کب یہ چمن میں مائلِ فریاد ہی رہی
تکلیفِ قیدِ دام سے آزاد ہی رہی

(۱۲)

دیتی ہے لطف آنکھ کو شادائی چمن
پتے وہ سبز پھول کے، وہ صاف پیرہن
وہ سادگی وضعِ گلِ نرگس و سمن
وہ ٹیڑھی ٹیڑھی سر پہ کلاہیں وہ بانگین
بے خوف پھول ہیں دلِ آزاد کی طرح
گلزار میں اکڑتے ہیں شمشاد کی طرح

(۱۳)

اک جا لہک رہا ہے قیامت کا سبزہ زار
اک سمت نغمہٴ سنجی بلبل کی ہے پکار
شاخیں جو جھومتی ہیں ہواؤں سے بار بار
دامانِ گل سے گر رہے ہیں دُرِ آبدار
بادِ چمن کا لطف ہر اک گل سے پوچھئے
پھولوں کی تازگی دلِ بلبل سے پوچھئے

(۱۴)

ہر گل کی سونگھ سونگھ کے بو مست ہیں نہال
کانٹوں سے اُلجھا جاتا ہے سنبل کا بال بال
سر سبز حد کا پاتا ہوں جب گلشنِ خیال
ہو جاتا ہے خوشی کی جگہ قلب کو ملال
بھائے نہ تازگی مرے قلبِ ملول کو
چھالے سمجھ رہا ہوں میں شاخوں میں پھول کو

(۱۵)

راتوں کی نیند ہوگئی اس فکر سے حرام
کیا ذکرِ تازگی کہ ہے پڑمردگی سے کام
جائے بہار لب پہ مرے ہے خزاں کا نام
نفرت ہوائے سرد سے ہے قلب کو مدام
راحت نہیں پسند کہ ایذا اٹھائی ہے
صحرا کی میرے دل نے کڑی دھوپ کھائی ہے

(۱۶)

کیا اہلِ بزم کو یہ نہیں یاد واقعہ
وہ کون پھول ہے کہ جو بے آب ہی رہا
کس کو ملی نہ دشت میں دو روز تک غذا
کہتا ہوں صاف صاف وہ ہے شاہِ کربلا
یہ ظلم و جور اور کسی دل سے کب اٹھے
حقدار جو ہو نہر کا وہ تشنہ لب اٹھے

(۱۷)

آئی نہ تھی فقط گلِ زہرا ہی پر خزاں
تینوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے تھے کئی جواں
جس گل پہ بارِ قطرہٗ شبنم بھی تھا گراں
تھا رن میں زیرِ زانوئے قاتل وہ ناتواں
چھوڑا تڑپ تڑپ کے جہانِ سیاہ کو
پوچھو دہانِ زخم سے ایذائے شاہ کو

(۱۸)

جورِ خزاں سے خشک ہوا تھا گلِ علیؑ
مرجھائی عینِ نشو و نما میں ہر اک کلی
کب سر سے تیرگی سپہ کے بلا ٹلی
ہو کیا گہن سے مہرِ امامت کا منجلی
غمِ تیرگی سے بڑھ گئے ہر ذی حیات کے
اب تک یہ آفتاب ہے پردے میں رات کے

(۱۹)

باقی ہے ساتھ مہر کے تاروں پہ بھی گہن
ہمراہِ شاہِ قتل ہوئے سب وہ صفِ شکن
جلتی ہوئی زمیں پہ رہا غازیوں کا تن
ممكن نہ ساتھ شہ کے کسی کو ہوا کفن
افسانہ جفا سحر و شام رہ گیا
دنیا میں وہ رہے نہ رہے، نام رہ گیا

(مطلع ثانی) (۲۰)

جب قتل تا بہ ظہر ہوئے ناصرانِ شاہ
روئے ہر اک کے غم میں شہنشاہ دیں پناہ
دنیا سے سوئے خلد گئے سب وہ خیر خواہ
یاں تک کہ قتل ہو گئے زینبؑ کے رشکِ ماہ
جورِ اجل سے دولتِ اولاد لٹ گئی
ہمشیرِ شاہِ گود کے پالوں سے چھٹ گئی

(۲۱)

جو پاس ہیں امامؑ کے ان کا بھی ہے یہ حال
رخصت ہر ایک مانگ رہا ہے پئے جدال
ایسے ہوئے مُصرِ شہِ دیں سے یہ خورد سال
مرنے کا اذن پا گئے مسلمؑ کے نونہال
دل کی طرح سے اکبرؑ وقاسمؑ قریب ہیں
خود بخت کہہ رہا ہے بڑے خوش نصیب ہیں

(۲۲)

پہلے ہر اک عزیز سے لی جنگ کی رضا
اب اس سے بڑھ کے خوبی قسمت ہو کیا بھلا
مانع انہیں نہ ہو سکے سلطانِ کربلا
توفیق اور ان کے ارادوں میں دے خدا
پسا وہ فوج کیں ہو جدھر یہ نظر کریں
ان چھوٹے چھوٹے نیچوں سے جنگ سر کریں

(۲۳)

گھوڑے بڑھا کے جا پڑے فوجوں پہ وہ جری
دکھلائی تھے ہاتھوں سے لشکر کی ابتری
دو لاکھ پر دکھا گئے ایسی دلاوری
اب تک ہر اک زبان پہ ہے ذکرِ صفدری
جنگل میں آتے ڈرتے ہیں اس دن سے شیر بھی
مانے ہوئے ہیں تیغ کا لوہا دلیر بھی

(۲۴)

مجبور گر قضا سے نہ ہوتے وہ دلربا
باقی نہ رہتی نام کو بھی فوجِ اشقیا
بے غیرت اس طرح تھے مگر سب وہ بے حیا
بچوں پہ مل کے ٹوٹ پڑی فوجِ پُر دغا
خوں میں وہ مرتے مرتے ہزاروں کو بھر گئے
گو جانِ رن میں دی پہ بڑا نام کر گئے

(۲۵)

پھر رن میں آئے حضرتِ زینبؓ کے لاڈلے
دل کی طرح تڑپتے ہوئے نیچے چلے
جسمِ عدو بھڑکتے ہوئے شعلوں سے جلے
موت آئی، آ گیا جو کوئی تیغ کے تلے
پورا وہ فضلِ حق سے ہوا قصد جو کیا
مرحب کی طرح تا بہ کمر اس کو دو کیا

(۲۶)

اللہ کیا دلیر تھے زینبؓ کے ارجمند
سالم نہ رکھا تیغ سے اعدا کا بند بند
رن میں ہر اک گلے کو شجاعت ہوئی کمند
بھگدڑ کئے تھا دشت میں اڑتا ہوا سمند
بے بس قدم کے نیچے وہ مغرور ہوتے تھے
ٹاپوں سے ہر سوار کے سر چور ہوتے تھے

(۲۷)

کھاتے کسی طرح سے نہ یہ مہ لقا شکست
لشکر کا نئے سرے سے نہ ہوتا جو بندوبست
کھاتے ہی رہتے زخمِ تنوں پر وہ فاقہ مست
ہو جاتی ایک حملہ میں کل فوجِ شام پست
تھا دشمنوں کے لب پہ بھی غل واہ واہ کا
خیمہ گرا چکے تھے رئیسِ سپاہ کا

(۲۸)

تھا جس جگہ ملیں پسر سعد کینہ خواہ
تھی جائے قلب فوج تو بے حصر تھی سپاہ
تھا وہ مقام گیسوئے لیلا سے بھی سیاہ
چار آئینہ نہ ہوتے تو کچھ سوچتی نہ راہ
ظلمت تھی سر پہ چھائی ہوئی نور کی طرح
دن اس جگہ پہ تھا شبِ دیبور کی طرح

(۲۹)

کس وقت ان دلیروں نے پایا ہجوم عام
ہے جب گراں تھکے ہوئے ہاتھوں میں خود حسام
تھا پہلے ہی سے قلب میں لشکر کا اہتمام
رن کی بھی ان کے ساتھ سمٹ آئی فوجِ شام
انبوہ اپنے پاس سے کیونکر جدا کریں
زینبؓ کے لال ایسی جگہ گھر کے کیا کریں

(۳۰)

مڑ کر یہ ایک بھائی نے اک بھائی سے کہا
مجبور ہم کو پا کے سمٹ آئے اشقیا
طاقت ہمیں جواب نہ دیتی تو تھا مزا
لیکن پہنچنا چاہئے قربِ شہِ ہدا
فوجیں بھگا کے لے چلو حضرت کے سامنے
گرنا سمند سے درِ دولت کے سامنے

(۳۱)

جب یہ صلاح کر چکے جرّار و بُردبار
کرنے لگے دلیر دو دُستی وہاں پہ وار
طرفہ سماں تھا خونِ جہندہ سے آشکار
ہر سر سے اونچی تھی قدِ آدم لہو کی دھار
یوں دیکھتے تھے اہلِ فلک انقلاب کو
دھوتا تھا خون اُڑ کے رخِ آفتاب کو

(۳۲)

کچھ دیر قلبِ فوج میں اس حد کی کی وغا
تھی جتنی کشمکش کھلا اتنا ہی راستا
پھر لشکرِ جفا میں پڑا ایک تہلکہ
نکلے تو نیچوں کی مدد سے وہ مہ لقا
گو اس جگہ سے دشمن جاں دور ہو گئے
یہ خود بھی سر سے تا بہ قدم چور ہو گئے

(۳۳)

پر جو کہا تھا منہ سے اسی طرح سے کیا
کرسی پہ جلوہ گر تھے جہاں شاہِ کربلا
لائے وہیں پہ ریل کے افواجِ اشقیا
عباسؑ جس جگہ تھے گرے واں یہ مہ لقا
قائل شجاعتوں کے ذرہ پوش ہو گئے
دے کر صداِ امامؑ کو بے ہوش ہو گئے

(۳۴)

دیکھا جو بازوئے شہ دیں نے یہ ماجرا
جھپٹے یہ کہہ کے حضرت عباسؑ با وفا
آقا! شہید ہو گئے زینبؑ کے دلربا
موت آئی عینِ فتح میں یہ کیا غضب ہوا
زخمی جو تھے تو دشت سے خیمہ کو پھر پڑے
تسلیم کر کے شاہ کو گھوڑے سے گر پڑے

(۳۵)

بھائی سے جب یہ شہ نے سنی غم کی داستاں
کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے سلطانِ انس و جاں
جاری تھی دم بدم لبِ حضرت پہ یہ فغاں
اے بھائی میرے گود کے پالے گئے کہاں
رنج و غم و ملال جگر پر اُٹھاتے ہیں
ٹھہرو کہ ہم بھی لاش پہ بچوں کی آتے ہیں

(۳۶)

فرما کے یہ بڑھے سوئے عباسؑ با وفا
واں دل سنبھالے آئے شہنشاہِ کربلا
بے ہوش جس جگہ تھے وہ اطفالِ مہ لقا
سینے سے بھانجوں کو لگا کر یہ دی صدا
بیتاب اپنے غم سے کلیجے کو کر گئے
زندہ ہو انتظار میں یا گر کے مر گئے

(۳۷)

دیتے وہ کیا جواب شہنشاہِ خاص و عام
لب ریز کر چکی تھی قضا زندگی کا جام
بچوں کو موت سے نہ ملی مہلتِ کلام
گودی میں شاہِ دیں کے تڑپ کر ہوئے تمام
نکلی جو روح جسم سے تن سرد ہو گئے
پایا یہ چینِ گود میں شہ کے کہ سو گئے

(۳۸)

اس طرح روئے دیکھ کے یہ حال شاہِ دیں
دل کی طرح سے دشتِ بلا کی ہلی زمیں
بچوں نے کچھ کہا جو نہ تھا وقتِ واپسین
تھا اس ملال و رنج سے دل اور بھی حزیں
قاسمؑ بھی دل سنبھالے ہوئے جان کھوتے تھے
ہمراہ شاہِ اکبرؑ و عباسؑ روتے تھے

(۳۹)

القَصَّہ لائے میتیں گھر میں شہ ہدا
روئیں لپٹ کے لاشوں سے یوں بنتِ مرتضیٰ
جس سے کہ بیبیوں میں قیامت ہوئی بپا
لاشے اٹھا کے لے گئے سلطانِ کربلا
غم کی یرش سے راحتیں روپوش ہو گئیں
جب میتیں نہ پائیں تو بے ہوش ہو گئیں

(۴۰)

دولہا کی ماں نے دیکھا جب اس طرح سانحہ
زینبؑ کے لاڈلوں نے بھی کی دہر سے قضا
کہنے لگی یہ قلب سے وہ غم کی مبتلا
قاسمؑ نے کیوں چچا سے نہ لی اب تلک رضا
اذنِ وغانہ ملنے سے بھی منہ نہ موڑتے
گر کر قدم پہ شاہ کے ہاتھوں کو جوڑتے

(۴۱)

دولہا کی لفظ لائے ہو ذخیر جو تا زباں
نوشاہ کیا بنا تھا یہ جنت کا میہماں
تفصیل اس خبر کی ذرا کیجئے بیاں
تھوڑا سا طول ہوگا نہ یاں طبع پر گراں
ہر دل میں یاد ہو تو فراموش کیوں رہو
شائق ہوں اہلِ بزم تو خاموش کیوں رہو

(۴۲)

اک مجلسی نے تو نہیں لکھا یہ حالِ زار
پر ہوگی اس بیان سے تہمت نہ زینہار
ہے عقد، بست و ہشت کتابوں سے آشکار
گل پر حسن کے بن کے خزاں آئی تھی بہار
شادی وہ ختم چند دقیقے میں کل ہوئی
یوں گل کھلے کہ شمع حیات آہ گل ہوئی

(۴۳)

ساری مصیبتوں کا جو شہ پر ہے خاتمہ
واقع ہوا ہو عقد جو رن میں عجب ہے کیا
گل اہلِ درد جانتے ہیں اس کا ماجرا
بیٹی کا رائڈ ہونا بھی ہے قہر و بد بلا
بنتا ہے سینہ تنگ قفسِ جان کے لئے
دشوار زیست ہوتی ہے انسان کے لئے

(۴۴)

کرتا بیاں میں اور مگر طول کا ہے ڈر
سچی اگر نہیں، تو نہیں جھوٹ بھی خبر
ذخیر پلٹ کے خیمہ کی جانب کرو نظر
مضطرب ہے حد کی مادرِ نو شاہِ نوحہ گر
دل سے یہ کہہ رہیں ہیں کہ واری کہاں پہ ہو
قاسمؑ وغانہ کو جاؤ تو احسان ماں پہ ہو

(۴۵)

تم پر چچا نے کی ہیں لڑکپن سے محنتیں
کاہے کو یاد ہوئیں گی چھٹپن کی صحبتیں
تم جتنے بڑھتے جاتے تھے بڑھتی تھیں الفتیں
کیوں صدقے جاؤں یاد ہیں شہ کی ریاضتیں
آرام، رن میں جاؤ تو اے نور عین آئے
دولہا بنے ہوئے جو سدھارو تو چین آئے

(۴۶)

یاں ان کا یہ بیاں تھا ادھر قاسمؑ جری
کرتے تھے شہ سے عرض کہ حسرت ہے جنگ کی
مولا ہوئی ہے دیر مرے مرگ میں بڑی
دبجے رضا جہاد کی اے دلبر علیؑ
خیمہ میں کس سے قسمتِ بد کا گلا کروں
چارہ سوائے مرگ نہیں اب میں کیا کروں

(۴۷)

یہ کہہ کے رکھ دیا قدمِ شاہِ دیں پہ سر
سنبھلا کسی طرح سے نہ جب سینے میں جگر
رویہ تڑپ تڑپ کے وہ ناشاد و نوحہ گر
نعلینِ پائے شاہِ ہوئے آنسوؤں سے تر
بجلی کی طرح قلبِ فسرہ کا حال تھا
دل کا وفورِ غم سے سنبھلنا محال تھا

(۴۸)

دیکھا امامِ دیں نے جب اس طرح دل کا حال
بولے گلے لگا کے شہنشاہِ خوش خصال
اے جانِ عمِ جگر کو نہیں طاقتِ ملال
اچھا خوشی یہی ہے تو لو رخصتِ جدال
اس رنجِ نے بہا دیئے آنسو تھے ہوئے
جنت میں جاؤ دہر سے دولہا بنے ہوئے

(۴۹)

مسرور لے کے اذن ہوا قلبِ خوش نہاد
تھا جتنا رنجِ اتنی خوشی بھی ہوئی زیاد
پھولوں نہ دل سماتا تھا آئی جو تھی مراد
تسلیم کی امام کو با قلبِ شاد شاد
شادی نے عینِ غم میں جو چہرہ دکھا دیا
آنسو تھے نہ تھے کہ جری مسکرا دیا

(۵۰)

جب اذنِ جنگ دے چکے شہنشاہِ زماں
ہنستے ہوئے مکاں کی طرف یہ ہوئے رواں
ڈیوڑھی پہ منتظر تھی ادھر دیر سے جو ماں
دیکھا رنجِ پسر تو یہ کرنے لگی بیاں
دل پر چچا کے ہجر کا غم دے کے آئے ہو
واری بتاؤ اذنِ وفا لے کے آئے ہو

(۵۱)

جب تک نہ کچھ کہو گے رہوں گی میں بے قرار
واری یہ ماں پھوپھی سے تمہاری ہے شرمسار
پہلو میں قلبِ زار تڑپتا ہے بار بار
جب تک نہ جان دو گے رہوں گی میں اشکبار
قاسمِ تمہاری موت سے ہے زندگی مری
جائے گی لاش دیکھ کے شرمندگی مری

(۵۲)

ہنس کر پسر نے مادرِ مغموم سے کہا
کیوں ہوں کسی سے آپ نخلِ مل گئی رضا
بیٹے سے اپنے مژدہ جاں بخش جب سنا
دولہا کو راند ماں نے گلے سے لگا لیا
شادی مٹی ملال کا سب طور ہو گیا
لپٹا لیا جگر سے تو دل اور ہو گیا

(۵۳)

آنسو بھر آئے آنکھوں میں تڑپا جو قلبِ زار
دل نے کہا کہ خوب سا کر لو پسر کو پیار
یہ آخری ہے دید، یہ ملنا ہے یادگار
دولہا نہ اب ملے گا اجل ہے گلے کا ہار
پھر دیدِ نورِ عین کی باری نہ آئے گی
رن سے پلٹ کے گھر میں سواری نہ آئے گی

(۵۴)

بیتاب گو تھا ہجر سے فرزند کے جگر
بولی مگر یہ مادرِ ناشاد و نوحہ گر
میری تو اس کی راہ میں ہے صبر پر نظر
پر مصلحت ہے اس میں کہ ہو عازمِ سفر
تم بنتِ ابنِ شیرِ الہی سے ملتے جاؤ
ماں صدقے ایک رات کی بیاہی سے ملتے جاؤ

(۵۵)

سن کر دولہن کا نام ہوئے اشکِ خوں رواں
روتا ہوا گیا سوئے جملہ وہ ناتواں
دیکھا وہ حال جس سے ہوا اور دل تپاں
زانو پہ سر جھکائے ہے بنتِ شرّ زماں
حکمِ حیا سے بند محبت کی راہ ہے
نے تابِ گفتگو ہے نہ تابِ نگاہ ہے

(۵۶)

دل ان کا چاہتا تھا کہ میں کچھ کروں کلام
بولی مگر یہ موت نہیں دیر کا مقام
رن میں کھڑے ہوئے ہیں شہنشاہِ خاص و عام
عباسؑ بڑھ نہ جائیں سوئے فوجِ روم و شام
پھر کچھ نہ ہوگا تڑپو کہ بے حد بُکا کرو
وہ اذنِ جنگِ شاہ سے لے لیں تو کیا کرو

(۵۷)

سن کر بیانِ موت رہی قلب کو نہ تاب
نے خود کیا سوال نہ پایا کوئی جواب
اُٹھے حسامِ دوش پہ رکھ کر بصدِ شتاب
لیکن دولہن سے بات نہ کرنے کا تھا حجاب
دل منتشرِ فراق سے تھا گیسوؤں کی طرح
گھر سے چلے تڑپتے ہوئے آنسوؤں کی طرح

(۵۸)

جملہ سے تا بہ صحن جو پہنچا وہ لالہ فام
دیکھا کہ یاں کھڑی ہوئی ہیں بیبیاں تمام
قاسمؑ نے سب کو جھک کے کیا آخری سلام
ہاتھوں سے دل کو تھام کے ماں نے کئے کلام
ہونے دیا نہ موت نے پورا جواں تمہیں
جی بھر کے دیکھنے بھی نہ پائی یہ ماں تمہیں

(۵۹)

ملتا ہوا جو جاتا تھا سب سے وہ دلربا
رونے کا شور بیبیوں میں در تلک رہا
برجِ شرف سے جب نکل آیا وہ مہ لقا
بیتِ الحزن میں ایک اندھیرا سا چھا گیا
یہ حال بیبیوں کا مصیبت میں ہو گیا
آنکھوں سے نورِ صورتِ یعقوبؑ کھو گیا

(۶۰)

آئے یہ پوچھتے ہوئے آنسوِ قریبِ شاہ
کی عرض سب سے مل چکا حضرت کا خیر خواہ
آمادہ ہے وغا پہ اُدھر شام کی سپاہ
کیا حکم ہے غلام کو اے شاہؑ دیں پناہ
تاخیر اب نہ چاہئے دل کی امنگ میں
ارشاد ہو تو جاؤں میں میدانِ جنگ میں

(۶۱)

بولے گلے لگا کے یہ شاہؑ فلک وقار
بہتر منگائیے درِ دولت پہ راہوار
گو صدمہٴ فراق سے ہے قلب بے قرار
لیکن ہم اپنے ہاتھ سے کر دیں تمہیں سوار
مضطرب ہے دلِ صغیر جو اے نورِ عین ہو
تم بیٹھ لو جو زمینِ فرس پر تو چین ہو

(۶۲)

یہ ذکر تھا جو آ گیا اسپ سبکِ خرام
نزدیکِ راہوار بڑھے شاہؑ خاص و عام
زیں پر بٹھا کے ہٹ گئے عباسؑ نیک نام
خادم نے بڑھ کے ہاتھ میں دولہا کے دی لجام
جاتے ہی صدرِ زیں پہ یہ جرّار تن گیا
گھوڑا، کھنچی جو باگ تو طاؤس بن گیا

(۶۳)

بے چین ہو رہا تھا جو شدید تیز گام
اس وقت تک یہ زین پہ گاٹھے رہے لجام
جب تک نہ کر لیا شہِ مظلوم کو سلام
عباسِ نادر سے بھی یہ کئے کلام
رخصت حضور آپ بھی خادم کو کیجئے
یہ آخری غلام کی تسلیم لیجئے

(۶۴)

جب سب سے مل چکا شہِ مسموم کا پسر
گردن پھرا کے اسپ انے راکب پہ کی نظر
مطلب یہ تھا چلوں میں سوئے فوج بدگھر
چہرے کو دیکھتے ہی ملی قلب کی خبر
درجہ ملا یقین کا وہم و خیال کو
سمجھا فراستوں سے فرس دل کے حال کو

(۶۵)

گاٹھی انہوں نے باگ بڑھا جب وہ تیز پا
میدان پا کے اور بھی چالاک ہو گیا
بن میں کبھی چلا تو فلک پر کبھی اڑا
وہ پیاری شوخیاں تھیں کہ تھی قدرتِ خدا
یہ طرفہ بات ہے یہ جہاں تھا وہیں نہ تھا
سایہ زمیں پہ رن میں کہیں تھا، کہیں نہ تھا

(۶۶)

جادو کی طرح ہے فرس تیز پا کی چال
آساں اسے سمجھتا ہے جو امر ہے محال
ہے شکل سبزہ روندے ہوئے گلشنِ خیال
قلبِ زمیں کی طرح ہوا بھی ہے پائمال
معدونیت جو دشت کے نقش قدم میں ہے
اہلِ جہاں سمجھتے ہیں کتمِ عدم میں ہے

(۶۷)

اثبات میں ہونفی کا شک ہے خدا کی شان
چلتا ہے یہ زمیں پہ سمجھتا ہے آساں
اڑ کر گیا ہے عرش پہ گیتی کو ہے یہ دھیاں
میدانِ حشر میں ہے یہ مردوں کو بھی گمان
نیرنگیاں یہ چال سے اپنی دکھا گیا
کل حشر کی خبر تھی مگر آج آ گیا

(۶۸)

ملتا ہوا ہے گردشِ دنیا سے اس کا رنگ
عالم بدل بدل کے چلا اسپ شوخ و شنگ
پہنچا فلک پہ دہر کی وسعت ہوئی جو تنگ
دل سے مٹی نہ تیز روی کی مگر امنگ
سرعت سے زیر پا ہے وہ جادہ جدھر کا ہے
خود جانتا نہیں کہ ارادہ کدھر کا ہے

(۶۹)

ہے محو دیکھ دیکھ کے خود آپ اپنی چال
جس راستے کو طے کریں سیارے ماہ و سال
ہے اک، جنوب و شرق ہوں یا مغرب و شمال
جانا کسی جگہ پہ نہیں اسپ کو محال
عرصہ ہو جتنا اٹھنے میں نیچی نگاہ کو
طے اتنی دیر میں یہ کرے اتنی راہ کو

(۷۰)

اللہ رے فرس کی تلونِ مزاجیاں
بے اصل جس کے سامنے ہے گردشِ جہاں
ہے وہ جہاں خفیف سا ہوتا ہے واں گماں
آنکھوں میں ہے مقام، پہ دل پر نہیں عیاں
نظروں میں ہے سمائے جگر کو گماں نہ تھا
نزدیک اس قدر تھا پہ ظاہر نشان نہ تھا

(۷۱)

اب اس سے بڑھ کے اور ہوسرعت کا کیا یقیں
کرتے ہیں جس کی مدح اُسے دیکھتے نہیں
پستی کو دیکھو دوڑنے میں زیں گری کہیں
کوسوں یہ چھوڑے جاتا ہے چلتی ہوئی زمیں
اتنا چلا مگر نہ تمنائے دل گئی
جو چیز ابھی چھٹی وہ قیامت سے مل گئی

(۷۲)

کیا چیز تھی یہ وسعتِ میدانِ کارزار
طے جس کو تھوڑے عرصہ میں کرتا یہ راہوار
چھٹ جاتا ہے قدم کے جو پیچھے کہیں غبار
ہوتی ہے اس کی تیز روی رن میں یادگار
آتے ہوئے صبا کو غم و رنج دے چلا
پیچھے ہوئے تند کو پلٹا کے لے چلا

(۷۳)

رفتار یہ نہیں ہے کراماتِ خوش خرام
مرضی پہ اس کی چھوڑ دے راکب اگر لجام
بڑھ جائیں آگے وسعتِ دنیا سے تین گام
طول اس جہاں کا ایک قدم میں کرے تمام
شامت ہوا کی آئے اگر سامنا کرے
روکے رہیں نہ یہ، تو خدا جانے کیا کرے

(۷۴)

آتے تھے یہ ادھر، ادھر افواجِ روم و شام
تھی منتظر کہ کون اب آتا ہے نیک نام
ہے کس جری و شیر کی آمد کی دھوم دھام
کرتی ہے گرد کس کی سواری کا اہتمام
عازم و غا کا بازوئے شہ ہے کہ عون ہے
کھلتا نہیں غبار کے پردے میں کون ہے

(۷۵)

ساکت فرس تھے، دل تھا سواروں کا بے قرار
دہلا رہا تھا قلب کو اٹھتا ہوا غبار
ہوتا نہ تھا جو امرِ نہاں رن میں آشکار
ٹیکے ہوئے تھا زین پہ زانو ہر اک سوار
دیکھیں بہادری جو نظر سے نظر ملے
مطلب یہ تھا کہ گرد پھٹے تو خبر ملے

(۷۶)

ناگہ ہٹا غبار، پکارا یہ دیدباں
آگاہ اس جواں سے ہو اے لشکرِ گراں
دولہا یہ ایک رات کا ہے کیا نہیں عیاں
آڑی پڑی ہیں دیکھ لو پھولوں کی بدھیاں
رن کی ہوا بھی کم نہیں بادِ نسیم سے
جنگل بسا ہوا ہے گلوں کی شمیم سے

(۷۷)

آتی ہے ان گلوں سے شجاعت کی ہم کو بو
ہوں گے تمہارے خون سے یہ پھول سرخرو
ساغر میں گل کے اوس کی جا دیکھو گے لہو
ان پھولوں کو ہے خون کے پینے کی آرزو
آگاہ ان سے دشت میں قلبِ ملول ہیں
اے فوجِ شام پیاسے کی بدھی کے پھول ہیں

(۷۸)

اللہ کیا دلیر و جری ہے یہ نوجواں
اُلٹا ہوا ہے ماتھے پہ سہرا بعزّ و شان
بیشک شکست کھائے گا یہ لشکرِ گراں
جرات کی دے رہی ہیں خبر ترچھی بدھیاں
آتا ہے کوئی دم میں زمانہ غریو کا
مشتاق اس کا ہاتھ ہے شاید جنیو کا

(۷۹)

تم سب کو رنگِ دستِ حنائی سے حق بجائے
لڑنے میں اس کی دید سے سر پر بلا نہ آئے
رنگِ حنا سے خوں نہ کہیں تن میں جوش کھائے
لبریز جامِ زیست ہوا ہے اُبل نہ جائے
پنچے میں آج موت کے ہر ذی حیات ہے
کہتا ہوں صاف رنگِ جہاں بے ثبات ہے

(۸۰)

گھوڑا چلے گا رن میں جری کا ہوا کی طرح
ہر سر پہ تیغ آئے گی ہر دم بلا کی طرح
ٹالے نہ یہ ٹلے گی سروں سے قضا کی طرح
پس جائے گا حسام سے ہر دل حنا کی طرح
اس امر میں خیال بھی لازم ہے غور بھی
ہاتھوں کی زیب ہوئے گی اس خوں سے اور بھی

(۸۱)

ہاں اے دلیرو! فوج کا پھر کر لو بندوبست
دیکھو شرابِ کبر سے ہر قلب ہو نہ مست
غازی کے ایک حملہ میں ہوگی سپاہِ پست
میدان میں اس کو فتح ہمیں ہوئے گی شکست
شاید شگونِ بد پہ تمہارا عمل نہیں
ہنسنا گلوں کے ہار کا یہ بے محل نہیں

(۸۲)

آفت کی بھی خزاں پہ ہے ان پھولوں پر بہار
ہنستے ہیں شب کی طرح ابھی تک یہ بار بار
بادِ سمومِ دشت ہے پھولوں سے مشکبار
ڈالے ہوئے گلے میں ہے باہیں گلوں کا ہار
رشتے میں کب گرے ہوئے دل کو سنبھالے ہیں
پھولوں نے اپنے قلب کے ارماں نکالے ہیں

(۸۳)

کیا اس سے لڑ سکو گے تم اے ساکنانِ شام
خواہاں یہ موت کا ہے، نہیں زندگی سے کام
سر کے گا پیچھے کھیت کے اس کا نہ ایک گام
ہرگز نہ مرتے مرتے ہٹے گا یہ لالہ فام
اب کیا یہ رن سے جائے گا منہ اپنا موڑ کے
آیا ہے ایک رات کی بیاہی کو چھوڑ کے

(۸۴)

تعریفِ دیدباں ہوئی لشکر کو ناگوار
کہنے لگے بگڑ کے کئی رن میں نابکار
بودا ہر اک کو جان لیا او ستم شعار
کھل جائے گا شروع تو ہونے دے کارزار
کب تک کرے گا قتل کوئی حد جفا کی ہے
گل فوج بھاگے ایک سے قدرت خدا کی ہے

(۸۵)

دولہا نے جب سنا سپہ کیوں کا یہ بیاں
آیا جلال، چڑھ گئیں ابرو کی تیوریاں
کہنے لگے پکار کے اے لشکرِ گراں!
سچ کہتے ہو، ہوا ابھی جاتا ہے امتحاں
لو آؤ دیکھ لو مرے دل کی امنگ کو
لاشوں سے پاٹے دیتا ہوں میدانِ جنگ کو

(۸۶)

کہنا تھا جو وہ کہہ چکا سب تم سے دیدباں
بہتر، بڑھے وغا کے لئے لشکرِ گراں
آؤ تو لوں میں میان سے تیغِ شرفشاں
مضطرب ہیں دیر سے مرے بازو کی مچھلیاں
ارماں بہت ہے تیغ کو گھوڑے کے ساتھ کا
اب بے لڑے تو درد نہ جائے گا ہاتھ کا

(۸۷)

یہ کہہ رہے تھے آپ جو لشکر سے آئے تیر
بیٹھا سنبھل کے زیں پہ حسن کا مہ منیر
بڑھ آئے زد پہ تیغ کی جس دم جوان و پیر
لی آپ نے بھی میان سے شمشیر بے نظیر
دولہا کے پاس زیب دہ انجمن چلی
لو جملہ نیام سے باہر دلہن چلی

(۸۹)

نکلی عجیب شان سے شمشیر برق زا
گھونگھٹ ہٹا نیام کا چہرا نظر پڑا
یہ رنگِ عکس دستِ حنائی سے حال تھا
تھے لال بے لڑے ہوئے یہ سر سے تا بہ پا
نوشاہ ہے جو ہاتھ میں اپنے لئے ہوئے
پوشاکِ سرخ زیب بدن ہے کئے ہوئے

(۹۰)

تھی ناگوارِ طبع جو لشکر کی گفتگو
جھپٹا بڑے جلال و غضب میں یہ ماہرو
کہتا تھا دل سے لختِ دل شاہِ نیک خو
قاسم کرو ونا میں دلیروں کی جستجو
معلوم کچھ تو ہو سپہ کینہ خواہ کو
دو ان کو قتل کر کے ہزیمت سپاہ کو

(۹۱)

یوں تو نہ ہوئے گی یہ سپہ مائل فرار
کثرت پہ اپنی بھولے ہوئے ہیں ستم شعار
میدان میں تھوڑی دیر کرو جم کے کارزار
جو وار ہو بلا کا ہو ہنگام گیر و دار
آئے سپر پہ پڑ کے یہ گھوڑے کی زین تک
تلوار کاٹتی ہوئی اوٹھے زمین تک

(۹۱)

یہ دل سے کہہ کے لی فرس تیز کی لجام
آئی ہر ایک سر پہ قضا کی طرح حسام
کیسا چھلکنا ٹوٹ گئے زندگی کے جام
مئے کی طرح سے گرنے لگے ساکنانِ شام
گرتے ہی ظلمِ موت سے بیگانہ بن گئیں
آنکھیں کھلی ہوئی لبِ پیانہ بن گئیں

(۹۲)

آفت بپا کئے ہوئے تھی تیغِ شعلہ ور
دستِ قضا سے فوج کو ملتا نہ تھا مفر
ہوتے تھے دشتِ کیں میں جو پامال بد گھر
دیتے تھے چور ہو کے صدا کا سہ ہائے سر
راحت فنا سے زیرِ سم بادِ پا ملی
سر جس قدر اٹھایا تھا اتنی سزا ملی

(۹۳)

ہاں اے قلم ہو گرمیِ عاشور پھر بیاں
گو کہہ چکا ہے تو پہ نہ لا دل میں کچھ گماں
ہے اختیارِ نظم پہ ہو جائے تا عیاں
لیتے ہیں ماہرانِ سخن تیرا امتحان
گو بحر بھی ہے ایک مگر کچھ الم نہیں
شامل ہے فضلِ حق تو کوئی دل پہ غم نہیں

(۹۴)

پر یہ رہے خیالِ مطوّل نہ ہو بیاں
کرنا ہے آگے ذکر تجھے جنگِ پہلوں
انصاف ہے تو داد بھی پائے گا بے گماں
مشتاق سب ہیں تو سنِ خامہ کی لے عنان
پشمرده برگِ سروِ الف ہوں پھلے ہوئے
ٹپکیں زبانِ کلک سے نقطے جلے ہوئے

(۹۵)

اللہ ری حرارتِ شمشیر شعلہ رو
تھی وقتِ جنگِ شمع کی لو ہر رگِ گلو
پھٹکتے تھے اس کی آگ سے یوں پیکرِ عدو
پارہ کی طرح جسم سے اڑ جاتا ہے لہو
آگاہ تیغ و موت ہے اک اس کی لاگ سے
دم بھر نہ ٹھہرا قطرہ خوں دل کی آگ سے

(۹۶)

پھیلا ہوا تھا گرمیِ خورشید کا اثر
تھا صورتِ چنار ہر اک باغ کا شجر
خود آگ کی طرح سے دہکتے تھے برگِ تر
پتوں میں منہ چھپا نہیں سکتے تھے جانور
تن جل رہے تھے سرد کلبجوں کا خوں نہ تھا
پوشیدگی میں بھی تو دلوں کو سکوں نہ تھا

(۹۷)

سائے میں بھی تھے دھوپ کی حدت سے دل کباب
ہر لحظہ بڑھتی جاتی تھی گرمیِ آفتاب
پانی پہ ٹوٹے پڑتے تھے ہر بحر میں سحاب
دیتی تھی موج بھر کے حبابوں کے جامِ آب
اللہ کیسی گردشِ تقدیرِ شوم تھی
پیاسوں کی تشنگی کے بجھانے کی دھوم تھی

(۹۸)

ہر چند خود وہ بحر تھا گرمی سے بے قرار
تڑپا رہی تھی موج کا دل دھوپ بار بار
باہر نکلتا بطنِ صدف سے تھا ناگوار
جا جا کے زیرِ آب چھپے دُرِ شاہوار
تھا غم جو پیاس کا دلِ پُر اضطراب پر
آتی تھیں تہہ میں مچھلیاں موتی کی آب پر

(۹۹)

تالیش زیادہ مہر کی جب بحر پر پڑی
دریا میں موج کی یہ صدا تھی جلی جلی
نازک دلوں پہ کیسی یہ حدت سے آہنی
چلتا نہ تھا جو زور تو تھی حد کی بے بسی
اُٹھتے نہ تھے جو غم تپشِ آفتاب کے
روتے تھے پھوٹ پھوٹ کے چھالے حباب کے

(۱۰۰)

کس طرح اپنی مردمِ آبی نہ جان دیں
پانی جو کھولتا ہو تو آرام کیا ملیں
قلب و جگر جلا جو رہی ہیں حرارتیں
لیبتی ہے موج، سطح پہ پانی کی کروٹیں
مانندِ مہر بحر میں گرداب ہو گیا
آرام دل کا گوہر نایاب ہو گیا

(۱۰۱)

ہیں میں جن کی طبع کو، مضطر ہیں وہ کمال
خاکِ زمیں کا پانی سے بڑھ کر برا ہے حال
کیوں ہوتا خاکساروں کے دل پر کوئی ملال
کر دیتا کاش تر عرقِ شرم و انفعال
ہوتیں ترقیاں نہ کبھی دل کے لاگ کو
کرتا کوئی تو سرد کلبجے کی آگ کو

(۱۰۲)

دم بھر زمینِ گرم پہ دل کو نہیں قرار
اُٹھتا ہے جب کنارے سے جلتا ہوا غبار
دامن سے ذرے چھوٹ کے گرتے ہیں بار بار
پانی میں صاف ہوتا ہے یہ امر آشکار
دریا میں ڈوبنے سے تپش دل کی جاتی ہے
چنگاریوں کے بجھنے کی آواز آتی ہے

(۱۰۳)

پیتاب حد کی تھی سپہ خانماں خراب
قلب و جگر جلا رہی تھی تیغِ شعلہ تاب
بڑھتی ہی جاتی تھی تپشِ روئے آفتاب
کھاتا تھا جوشِ مئے کی طرح ساغروں میں آب
بو ہر نفس میں قلب کے جلنے کی آتی تھی
پانی سے اور دل کی تپش بڑھتی جاتی تھی

(۱۰۴)

آرام میں وہ فوج ہے جو ہے کنارِ جو
بھڑکی ہوئی ہے دشت میں پر آگ چار سو
تڑپا رہی ہے پیاسوں کو پانی کی جستجو
دریا پہ شکلِ سیل چلے جاتے ہیں عدو
سیراب ہوتے جاتے ہیں آ آ کے گھاٹ پر
اک اژدہا حشر ہے دریا کے گھاٹ پر

(۱۰۵)

ساحل پہ اک کو ایک کی مطلق نہ تھی خبر
پانی پہ گر رہے تھے برابر وہ بد گھر
پیتا تھا کوئی، کوئی زہ کر رہا تھا تر
ٹھنڈا کسی کا جسم، کسی کا ہوا جگر
دریا پہ بھی اثر یہ ہوئے اضطراب کے
جلدی میں ٹوٹے جاتے تھے ساغرِ حباب کے

(۱۰۶)

ہر دل کو دشتِ ظلم میں تھا اشتیاقِ آب
دریا کو اٹھ کے دیکھتی تھی تیغِ برق تاب
زائل کسی طرح جو نہ ہوتا تھا اضطراب
جاتے تھے دشتِ ظلم سے دریا پہ شیخ و شاب
زائد تپش جو تھی دلِ پُر اضطراب کی
دوڑا رہی تھی رن سے ہوسِ جامِ آب کی

(۱۰۷)

تھا اُس طرف یہ حال ادھر تیغِ شعلہ زا
گر گر کے حشر کر رہی تھی دشت میں بپا
تھا رن میں ناریوں کو جہنم کا سامنا
تھی بادِ سامِ دامنِ شمشیر کی ہوا
جل جل کے قدرِ جسم نگاہوں پہ چڑھ گئی
چھالوں سے اور زینتِ آغوش بڑھ گئی

(۱۰۸)

تھی تیغِ برق زا پہ کسے طاقتِ نگاہ
ڈھالوں سے منہ چھپائے ہوئے رن میں تھی سپاہ
جلتی ہوئی حسام کے ہنگامِ رزم گاہ
شعلے بھڑک رہے تھے کہ اللہ کی پناہ
جس سر پہ آئی طالعِ قسمت چمک گیا
اس آگ کا اثر پسرِ سعد تک گیا

(۱۰۹)

کیا کیا لڑا ہے دشت میں اک رات کا بنا
ہر ضرب پر سپاہ میں برپا تھا تہلکہ
کھاتی تھی خوفِ سامنے آتے ہوئے قضا
رن کی زمیں دہل رہی تھی حشر تھا بپا
یہ حال ڈر سے ہو گیا اہلِ قبور کا
آوازِ یوق سمجھے کہ نالہ ہے صور کا

(۱۱۰)

میدانِ ظلم بھر گیا لاشوں سے چار سو
اس حد پہ رن میں قتل ہوئے تیغ سے عدو
باقی رہی نہ قلب میں لڑنے کی آرزو
تا ابنِ سعد بہہ کے گیا فوج کا لہو
راحت میں سیلِ خوں سے کچھ ایسا خلل پڑا
گھبرا کے پشتِ خیمہ سے باہر نکل پڑا

(۱۱۱)

واں تو رئیس فوج کا گذرا یہ حال زار
اس حد پہ اور یاں ہوئے مقتول نابکار
لائے مقابلہ کی نہ پھر تاب بدشعار
دولہا کے سامنے سے کیا فوج نے فرار
رن سے قدم سپاہ اٹھاتی ہوئی چلی
خاک آگے آگے راہ بتاتی ہوئی چلی

(۱۱۲)

میدان جنگ میں جو نہ تھا قلب کو قرار
ڈالے ہوئے فرس کو چلے جاتے تھے سوار
تھے پیروی گرد پہ نازاں ستم شعار
ازرق جہاں کھڑا تھا وہاں تھم گیا غبار
دامن ہوا سے تھوڑے ہی عرصہ میں پھٹ گیا
کچھ چپکے چپکے حال سپہ کہہ کے ہٹ گیا

(۱۱۳)

معلوم ہو چکی جو پریشانی سپاہ
لشکر پہ کی لعین نے بڑے غیظ سے نگاہ
بولا سران فوج سے مکار و کینہ خواہ
اک طفلِ فاقہ کش کی یہ وحشت ہے واہ واہ
شہرہ ہوا حجاز میں موصل کے نام کا
روشن چراغ خوب کیا ملکِ شام کا

(۱۱۴)

لاکھوں کا زور ایک سے رن میں نہ کچھ چلا
لیکن مری سمجھ میں یہ آتا ہے ماجرا
جراتِ ضرورت میں ہے ہم کیوں کریں گلا
بودا رئیس ہو تو سپہ کر سکے گی کیا
کیا کام، باہر آنے کی کون التجا کرے
خیمہ میں میر فوج ہو لشکر و غا کرے

(۱۱۵)

تسکین دل ہوئی جو سنے اس طرح کلام
کہنے لگی سرانِ جنود و سپاہِ شام
ہے واقعی و غا میں رئیس سپہ کا کام
اس کم توجہی نے تو کی زندگی حرام
پھر لطف ہوتا دشت میں تیغ آزمائی کا
میر سپہ کے ساتھ مزا تھا لڑائی کا

(۱۱۶)

یاں یہ بیاں تھا واں پسرِ سعد کینہ جو
سنتا تھا فوج و ازرقِ شامی کی گفتگو
گو برہمی سے جوش میں تھا جسم کا لہو
خاموش مصلحت سے رہا پروہ تیرہ رو
کچھ اور فکر تھی جو دلِ بد خصال کو
ازرق کے پاس ٹال کے آیا ملال کو

(۱۱۷)

پہنچا تو یہ کئے پسرِ سعد نے کلام
مٹی ہے آبرو مری اے پہلوانِ شام
گھونگھٹ سپاہ کھا چکی قصہ ہوا تمام
لڑنے جو آپ جائیں تو رہ جائے سب کا نام
شہرِ عراق ورے میں ہوں اس کارزار کے
آنسو چکھیں نبرد میں قاسم کو مار کے

(۱۱۸)

بولا وہ غیظ میں نہ کروں گا میں اس سے جنگ
بچے سے لڑنا دشت میں میرے لئے ہے ننگ
اک طفل پر کسوں گا نہ گھوڑے کا اپنے ننگ
کیا جانے تو کہ کیا ہے مرے قلب کی امنگ
ہو جاتا فیصلہ تن و سر کی جدائی کا
ہوتے حسین اگر تو مزا تھا لڑائی کا

(۱۱۹)

لیکن ترا ملال بھی ہے دل کو ناگوار
بہتر یہ امر ہے جو کرے قلب اختیار
ہیں میرے چاروں بیٹے جو یکتائے روزگار
ان میں سے جن کو حکم ہو دوں اذن کارزار
ہنگام گیر و دار شجاع و دلیر ہیں
تو جانے کیا یہ پیشہ جرات کے شیر ہیں

(۱۲۰)

القصہ رن کی چھوٹے پسر کو ملی رضا
ظالم یہیں سے اسپ پہ تننا ہوا چلا
قاسم نے بھی جو دور سے دیکھا یہ ماجرا
شوقِ وغا سے چھیڑ دیا اسپ بادپا
دیکھا نہ اس کے آنے کا رستا دلیر نے
اپنا شکار ٹوک لیا بڑھ کے شیر نے

(۱۲۱)

پایا بہت قریب تو سوچا یہ نابکار
پامال کر نہ دے کہیں غازی کا راہوار
جلدی کیا شیر نے نیزہ کا اپنے وار
رد کر کے ماری آپ نے شمشیر آبدار
ٹکڑے کیا سپر کی طرح مغز سر تلک
تلوار کاٹتی ہوئی آئی کمر تلک

(۱۲۲)

دو ہو کے گر پڑا جو وہ مکار و بے حیا
پھر دوسرے سے آپ ہوئے عازم وغا
یہ بھی ہوا جو قتل تو پھر تیسرا چلا
اس کی بھی آئی بُرشِ شمشیر سے قضا
دکھلائے فوج شر کو ہنر کارزار کے
تلوار روکی آپ نے چوتھے کو مار کے

(۱۲۳)

قاسم نے ہنس کے ازرق شامی سے پھر کہا
لے تیرے چاروں بیٹوں نے دنیا سے کی قضا
کیوں اب بھی عار و ننگ ہے او بانی جفا
ہم منتظر کھڑے ہیں بس اب آپے وغا
ضد دل کو تیرے قتل پہ ہے اور کد بھی ہے
کب تک رہوں میں دھوپ میں کچھ اس کی حد بھی ہے

(۱۲۴)

جب یہ سنا تو غیظ سے ظالم نے کی نگاہ
بیٹوں کے غم میں پہلے بھری ایک دل سے آہ
نوشاہ سے یہ کہنے لگا پھر وہ روسیہ
لیتا ہوں آ کے میں عوضِ خون بے گناہ
میدان میں وقت آ گیا اب میری جنگ کا
وہ اور بات تھی جو تصور تھا ننگ کا

(۱۲۵)

اپنے پرے سے کہہ کے یہ نکلا وہ پہلواں
تن اس قدر قوی تھا کہ تھا دیو کا گماں
جو منتخب تھے ان میں کا تھا یہ بھی اک جواں
دیتا ہوا سناں کو چلا ہاتھ سے ٹکاں
کس پر عیاں یہ کیفیت رنج و غم نہ تھی
آمدشتی کی دشت میں مرحب سے کم نہ تھی

(۱۲۶)

ذاتِ یہی تو وجہ تھی جو شہ تھے مضحل
اس غم سے قلبِ پاک پہ تھا رنجِ جانگسل
درگاہِ حق میں کہتا تھا یہ بار بار دل
تو اس کی رائڈ ماں سے نہ کرنا مجھے نجل
اپنی مراد قلب پہ یہ کامیاب ہو
ازرق پہ نورِ عینِ حسن فتح یاب ہو

(۱۲۷)

یاں لب پہ یہ دعا تھی، وہاں قاسم جری
دکھلا رہے تھے ازرق شامی کو بگدھری
کہتا تھا دمبدم یہ نہنگِ دلاوری
دیکھ آج رن میں فاتحِ خیبر کی صفوری
ظاہر اثر ہوں قسمتِ بد کی بگاڑ کے
دو حصے ایک وار میں ہوں گے پہاڑ کے

(۱۲۸)

بھولا رجز بھی غیظ میں مکار و پُر دغا
نیزے کا وار طیش میں غدار نے کیا
ترچھا ہوا جو زینِ فرس پر یہ مہ لقا
پہلو سے ان کے نیزہ خطی نکل گیا
ہوتا تھا زیب تیغ کو وہ کام، جو کیا
جب تک اُٹھے اُٹھے اُسے غازی نے دو کیا

(۱۲۹)

کہنے لگا یہ دل سے قلم جب ہوئی سناں
پیشکِ وحیدِ عصر و جری ہے یہ نوجواں
میں فتح اس پہ پاؤں یہ بیکار ہے گماں
ماہر سپہ گری سے ہے شہزادہ زماں
کھلتے ہی آنکھ غیظ میں آیا ہوا ہے یہ
عباس سے جری کا بتایا ہوا ہے یہ

(۱۳۰)

دل سے یہ کہہ چکا جو وہ ملعون و بدگھر
سینے میں مارے خوف کے تھرا گیا جگر
باندھی نہ پر فرار پہ غدار نے کمر
خود بھی جری جو تھا تو لیا گرزِ گاؤ سر
طالع بگڑ گئیں ہیں نحوست سے بوم کے
تولا لعین نے گرز رکابوں پہ جھوم کے

(۱۳۱)

فرق جری پہ اس نے دو دتی کیا جو وار
بجلی کی طرح کوند گئی تیغِ آبدار
سر تک ابھی نہ آیا تھا گرزِ ستم شعار
فرقِ عمود کاٹ گئی تیغِ شعلہ بار
شرمندہ وقتِ جنگ اجل تھی کئے ہوئے
حیراں شقی تھا ہاتھ میں دستہ لئے ہوئے

(۱۳۲)

ازرق کو مسکرا کے یہ قاسم نے دی صدا
غزا اسی کمال پہ تھا تجھ کو بے حیا
ہم سے وغا کا ننگ تھا او بانی جفا
بچے نے دی شکست ستگر یہ کیا ہوا
تھی آرزو وغا کی شہِ مشرقین سے
کیوں تو اسی کمال پہ لڑتا حسین سے؟

(۱۳۳)

یکتا سپہ گری میں ہے حیدر کا یادگار
آئے گا جب وہ وقت تو دیکھیں گے نابکار
غیظ ان کا ہوگا وقتِ وغا قہرِ کردگار
کھل جائے گا ہر ایک پہ ہنگام گیر و دار
تابِ مقاومت نہ ستمگار لائیں گے
کوفہ کو رن سے بھاگ کے غدار جائیں گے

(۱۳۴)

جب یہ سنا تو اور بھی برہم ہوا شریر
میدان دے کے گھوڑے کو جوڑا کماں میں تیر
قد اس قدر جھکا کہ ہوا وقتِ جنگ پیر
تو لے رہے یہ ہاتھ میں شمشیر بے نظیر
ظالم نے یوں عیاں کیا دل کی امنگ کو
چھوڑا نشانہ باندھ کے رن میں خدنگ کو

(۱۳۵)

نزدیک ان کے آگیا جب ناوک خطا
کر آئی اک اشارے میں دو تیغ برق زار
وہ بھی کٹا حسام سے آیا جو دوسرا
ترکش یوہیں تمام ستمگر کا ہو گیا
قلبِ حزیں جدا نہ ہوا غم کے ساتھ سے
پھینکا کماں کو خاک پہ جھلا کے ہاتھ سے

(۱۳۶)

آیا قریب پھر وہ جفاکار و کینہ جو
کی عرض اب تو تیغ کی رکھتا ہوں آرزو
یوں آپ کے کمال نے دل کر دیا لہو
خود مجھ کو اپنی موت کی ہے آج جستجو
میری وغا ہے شرم کے پہلو لئے ہوئے
رن سے قدم نہ سر کے گاہے جاں دیئے ہوئے

(۱۳۷)

فرمایا ہنس کے آپ نے کیوں انفعال لے
آتی ہے دم میں موت نہ دل پر ملال لے
ارماں وغا میں تیغ زنی کا نکال لے
میں منتظر ہوں قلب کو اپنے سنبھال لے
پائے گا اور سے نہ اماں یوں عدو کوئی
باقی دم وغا نہ رہے آرزو کوئی

(۱۳۸)

دم بھر ٹھہر کے میان سے ظالم نے لی حسام
کچھ اور پاس آگیا ان کے وہ تیرہ فام
گاٹھی انہوں نے بھی فرس تیز کی لجام
بجلی کی طرح بن گیا اسپ سبک خرام
سیلاب رن میں تھا صفت برق اگر نہ تھی
ایسا تڑپ رہا تھا کہ تاب نظر نہ تھی

(۱۳۹)

کامل تھا فن تیغ زنی میں جو بد شعار
آفت بپا تھی قہر تھے دونوں طرف کے وار
وہ با خبر اگر تھا تو یہ بھی تھے ہو شیار
جھکاریں تھیں حساموں کی گوشِ فلک کے پار
اہل سما بھی ڈرتے تھے شعلوں کے لاگ سے
دامن ملک بچاتے تھے، تیغوں کی آگ سے

(۱۴۰)

ہر وار پر دہلتا تھا میدانِ رزم گاہ
تیغیں وہ چل رہی تھیں کہ اللہ کی پناہ
گھوڑوں کی دوڑ دھوپ نے رن کر دیا سیاہ
ظلمت وہ تھی کہ کام نہ کرتی تھی کچھ نگاہ
دکھلائے چھپ کے اپنے ہنر ہر سوار نے
اٹھ کر احاطہ کر لیا رن کے غبار نے

(۱۴۱)

یہ کیفیت ہوئی جو دمِ جنگ آشکار
بڑھ آئے دیکھنے کے لئے اُس طرف سوار
جھپٹے ادھر سے حضرتِ عباسِ نامدار
آواز دی یہ آپ نے، قاسم! چچا نثار
رخ کی نہاں غبار میں تنویر کیوں ہوئی
ازرق کے قتل کرنے میں تاخیر کیوں ہوئی

(۱۴۲)

گھوڑا بڑھا کے گرد سے باہر نکل کے آؤ
ظالم کے راہوار کو بیٹا دبا کے لاؤ
چوٹیں جو اس کے پڑتی ہیں خالی نہ مسکراؤ
قوت بڑھے گی غیظ میں تلوار کو لگاؤ
نام اور دیر ہونے سے ہے نابکار کا
اچھا نہیں اسد سے اُلجھنا شکار کا

(۱۴۳)

ڈر ڈر کے پیچھے ہٹنے سے ظاہر یہ کیا نہیں
دل ہٹ گیا فرار پہ آمادہ ہے لعین
میدانِ جنگ سے نہ نکل جائے یہ کہیں
بس اب اُلٹ لو تھے سے کرتے کی آستیں

تیغ آئی زمینِ اسپ پہ دو کر کے ڈھال کو
دے کر جھکائی قتل کرو بدخصال کو

(۱۴۴)

سنتے ہی اس صدا کے بڑھا اور بھی جلال
ازرق سے بولا غیظ میں آکر حسن کا لال
تاخیر واقعی ہوئی اس جنگ میں کمال
کرتا ہوں اب میں وارِ خبردار، بدخصال

بالائے تیغ ہاتھ میں غدار ڈھال لے
دل کی طرح سے خود کو سر پر سنبھال لے

(ساقی نامہ) (۱۴۵)

کیوں ساقیا کھلا درِ میخانہ یا نہیں
مانندِ درد دل ہے یمِ غم میں تہہ نشیں
امید، مئے کی طرح ہے کس شیشے میں مکیں
چھیٹیں پڑیں نہ اڑ کے چڑھالے بس آستیں

ہم میکشوں کے پاس یہ جب تک نہ آئے گی
شیشے میں خونِ دل کی طرح جوش کھائے گی

(۱۴۶)

پڑ جائے گر تری نظرِ گرم ساقیا
جو چاہتا ہے قلب وہ حاصل ہو مدعا
کر آج مجھ کو خوشہ انگور وہ عطا
کھاؤں تو ہر عنب سے ملے مئے کا ذائقہ

دل میں سوا ولائے جنابِ امیر ہو
دانوں میں جس کے بادۂ خمِ غدیر ہو

(۱۴۷)

مئے مہر داغِ دل سا جھلکتی ہوئی تو دے
سرخِ خوں نہ ہو تو مہکتی ہوئی تو دے
ساغر میں شکلِ شعلہ دکھتی ہوئے تو دے
گر اور مئے نہ دے تو جھلکتی ہوئی تو دے

لبریز دے گا تو، تو دعا آج دوں گا میں
یہ جام تیرے ہاتھ سے خالی نہ لوں گا میں

(۱۴۸)

کیوں ساقیا! تو دینے سے مئے کے ہے منفعل
دے جام، تیری شرم سے ہوتا ہوں میں نخل
کیفِ شرابِ ناب سے مملو ہو جامِ دل
دو چار گھونٹ پی کے نہ ہو قلب مضطرب

دنیا کے غم کو بھولیں جو نشہ کا طور ہو
دورِ جہاں کی طرح سے ساغر کا دور ہو

(۱۴۹)

وہ جام دے جو صرف میں لایا ہوا تو ہو
گر کچھ نہ ہو تو لب سے لگایا ہوا تو ہو
ساقی سلسبیل سے پایا ہوا تو ہو
جنت سے تیری بزم میں آیا ہوا تو ہو

کوثر پہ جب میں جاؤں تو خود جان لوں اُسے
ساغر پہ آنکھ پڑتے ہی پہچان لوں اُسے

(۱۵۰)

آنکھوں کی طرح رنگ بدلتا ہوا ہو جام
جادوں کی طرح بزم میں چلتا ہوا ہو جام
دو آتش جو مئے ہو تو جلتا ہوا ہو جام
کھائے ہوئے ہو جوش اُبلتا ہوا ہو جام

قطرہ گرے تو قلب کی حسرت نکال لیں
ہم قوتِ نظر سے اُسے بھی سنبھال لیں

(۱۵۱)

مئے پی کے میکدے سے چلا سوائے رزم گاہ
دیکھا تو تیغ تول چکا ہے حسن کا ماہ
ہیں منتظر کھڑے ہوئے عباس عرش جاہ
تڑپی حسام پھر ہوا بجلی کا اشتباہ
چھائی گھٹا الم کی دل کینہ خواہ پر
کوندی وہ برق ڈھال کے روئے سیاہ پر

(۱۵۲)

بچنی سپر کو کاٹ کے جب مغز سر تک
آگے بڑھی جبین سے تو آئی جگر تک
دو صدر میں کیا دل بیداد گر تک
سینے سے اک اشارے میں آئی کمر تک
دو مرکب و سوار تھے جس دم نظر اٹھی
رن کی زمیں سے زین فرس کاٹ کر اٹھی

(۱۵۳)

جب اس طرح سے ازرق شامی کو دو کیا
تلوار رکھ کے دوش پہ جھوما وہ مہ لقا
سب دیکھتے تھے حضرت عباس با وفا
آواز دی بھتے کو شاباش و مرحبا
جرات نہ کیوں ہو نور نظر کس ولی کے ہو
یہ ضرب کہہ رہی ہے کہ پوتے علی کے ہو

(۱۵۳)

تعریف اپنی سن چکا جس دم وہ لالہ فام
کی عرض یہ جری نے چچا سے پس سلام
خادم کا دل بڑھاتے ہیں اے بازوئے امام
صدقہ یہ آپ کا ہے جو ایسا لڑا غلام
خادم حضور ہی کا سکھایا ہوا تو ہے
جو کچھ ہے آپ کا بتایا ہوا تو ہے

(۱۵۵)

غم اب نہ دل پہ مہر کی تابش کا کھائیے
ہے آفتاب ڈھال کو چہرے پہ لائیے
بیتاب دل مرا ہے نہ تکلیف اٹھائیے
شدت بہت ہے دھوپ کی خیمہ میں جائیے
دل مضحل ہے دیکھ کے ایذا جناب کی
اب اور بڑھ گئی ہے تپش آفتاب کی

(۱۵۶)

جب تک وغا میں محو تھا میں، تھا نہ کچھ خیال
لیکن برا ہے آپ کے خادم کا اب تو حال
شدت سے تشنگی کی ہوا جاتا ہوں نڈھال
اب زیت ناگوار ہے اے شیر حق کے لال
ثابت قدم جہاد میں رکھے خدا مجھے
جینے کے بدلے موت کی دیجے دعا مجھے

(۱۵۷)

کچھ اس قدر ہے گرمی خورشید کا تعب
آنکھوں میں میری روز وغا ہو گیا ہے شب
کیونکر کہوں کہ شاہ سے پانی کی ہے طلب
پاتا نہیں تری تو چباتا ہوں اپنے لب
کب قلب بے قرار مرا مضحل نہیں
اس پر بھی اے چچا کوئی تسکین دل نہیں

(۱۵۸)

کہتا ہوں گر امام دو عالم سے حال دل
ڈر ہے کہ قحط آب میں مجھ سے نہ ہوں نخل
کہتا ہوں قلب سے یہ کبھی ہو تو منفعل
تجھ سے سوا ہے اصغر بے شیر مضحل
آب فرات دیکھ اکیلے نہ جا کے پی
پانی اگر ملے بھی تو اس کو پلا کے پی

(۱۵۹)

حالِ دل و جگر لبِ کوثر کہوں گا اب
ایذائے تشنگی کا پڑا کس طرح تعب
ہے باعثِ ملالِ جگر زیست کا سبب
کچھ ایسا حالِ دل ہے کہ ہے موت کی طلب
پنہاں نہیں رہا سببِ برہمی مرا
اب اے چچا سلام ہے یہ آخری مرا

(۱۶۰)

یہ کہہ کے سوئے فوج چلا پھر وہ مہ لقا
یاں تو اُسی طرح سے ہوا حشر پھر بپا
دل ٹکڑے ان کا یوں سخنِ یاس نے کیا
پلٹے عجیب حال سے عباسؑ با وفا
دولہا کے غم میں جان کو کھوتے ہوئے گئے
بھائی کے پاس خیمہ میں روتے ہوئے گئے

(۱۶۱)

یاں تو یہ قربِ شہ گئے اور واں وہ مہ لقا
کرنے لگا سپاہ سے پھر دشت میں وغا
پھر دامنِ حسام کی چلنے لگی ہوا
پھر فوج میں بپا ہوا حملوں سے تہلکہ
یہ معرکہ بھی پہلی لڑائی سے کم نہ تھا
تینوں کی طرح جسم میں اعدا کے دم نہ تھا

(۱۶۲)

توڑا پرا اُدھر کا تو جھپٹے ادھر کبھی
دو خود و سر کیا کبھی، کاٹی سپر کبھی
دل سا کیا حسام نے ٹکڑے جگر کبھی
کاٹا گلا کبھی تو جدا کی کمر کبھی
اعدا سے زندگی ہی میں منہ پھیر لیتے تھے
کیا وقتِ بد تھا ساتھ نہ اعضا بھی دیتے تھے

(۱۶۳)

ہے آخری جو دشت میں نوشاہ کی وغا
تلوار کی بھی باڑھ کا انداز ہے جدا
ڈر سے نظر ملا نہیں سکتے ہیں اشقیا
ہو جاتے دو جو پہلے سے آتی کہیں قضا
چھپتی تھی موت لاشوں میں، ڈر سے یہ حال تھا
آتی جو زد پہ یہ بھی تو، بچنا محال تھا

(۱۶۴)

ہے واقعی خیال و تصور کا یہ مقام
کس سن میں جنگ کرتا ہے شیر کا لالہ فام
اور اس پہ یہ ستم کہ ہے دو دن سے تشنہ کام
روشن کن آفتوں میں بڑوں کا کیا ہے نام
یاں پر کسی شجاع کی جرأت سند نہیں
ہنگامِ جنگ ان کی دلیری کی حد نہیں

(۱۶۵)

گذرا نہیں یہ ظلم نگاہوں سے تا بہ حال
جو تھے بڑے شجاع انہیں بھی تھا یہ خیال
لاکھوں سے لڑنا جنگ میں سمجھا کئے محال
بس انتہا ہے ایک کرے سو سے گر جدال
رستم کی طرح وقتِ وغا سور ہو گیا
جو اس طرح لڑا وہی مشہور ہو گیا

(۱۶۶)

اس سن میں ان پہ وقتِ وغا ہے ہجومِ عام
ایسا جری نہ ہوتا حسن کا جو لالہ فام
کیا احتیاجِ گرز و سناں، ناوک و حسام
کافی تھا رن میں اک تنِ تنہا پہ اژدہام
لاتے نہ تاب جنگ کی یاں پر دلیر بھی
ہو جاتا قید ایسی جگہ آ کے شیر بھی

(۱۶۷)

بس ختم ہے علیٰ کے گھرانے پہ یہ وغا
ایسا شجاع و شیر ہوا ہے نہ ہوئے گا
برپا ہے اس ہجوم میں فریاد کی صدا
روکو حسام دشت میں اب بہرِ مصطفیٰ
تیغِ جری سے امن و اماں کی نہ جا ملے
کرتے ہیں توبہ اپنے کئے کی سزا ملے

(۱۶۸)

کانوں تک آیا دشت میں جب مصطفیٰ کا نام
پڑھ کر درودِ تھم گیا شبر کا لالہ فام
اب کیا تھامل کے ٹوٹ پڑے ساکنانِ شام
سہرا جہاں تھا پڑنے لگی اس جگہ حسام
آ کر عروسِ موت کئی بار رو گئی
دولہا کے سر کے خوں سے قبا سرخ ہو گئی

(۱۶۹)

گرز ایک کا پڑا تو پڑا ایک کا تبر
زخمی کسی سناں نے کیا سینے میں جگر
سر کے لہو کے بہنے سے کم ہو گئی نظر
آیا زمانہ شیب کا خم ہو گئی کمر
انبوہ دیکھ کر قدمِ اسپ رک گئے
ہاتھوں سے سر پکڑ کے یہ گھوڑے پہ جھک گئے

(۱۷۰)

لیکن یہ دمدم لبِ نازک پہ تھی صدا
کیوں کیا اماں کے دینے کا ہوتا ہے یہ صلہ
وہ کون سی خطا ہے کہ جس کی ہے یہ سزا
بدلا یہ مجھ سے لیتے ہو ازرق کے خون کا
اک جسمِ ناتواں پہ یرش کل جہاں کی ہے
مجھ سے کہو تو کچھ، یہ عداوت کہاں کی ہے

(۱۷۱)

ہوتی تھی اس سوال پہ برچھی جگر کے پار
دیکھا کسی کو گر تو پڑی تیغِ آبدار
طالب ہوئے مدد کے تو پہلو ہوئے فگار
گر آہ کی تو دل پہ چلے ناوکوں کے وار
نالوں کا قلبِ فوج پہ اُلٹا اثر پڑا
سر میں ہوا جو درد تو آکر تبر پڑا

(۱۷۲)

جاری تھا زینِ اسپ پہ دولہا کے سر سے خوں
آتا تھا آنسوؤں کی طرح چشمِ تر سے خوں
تھا جوش میں یہ تشنہ لبی کے اثر سے خوں
جلتا ہوا نکلتا تھا قلب و جگر سے خوں
زائد ترقیاں ہوئیں اندوہ و یاس کی
تکلیف اور بڑھ گئی زخمی کو پیاس کی

(۱۷۳)

خوں جس قدر بہا ہوئے اُتنے ہی یہ نڈھال
ضعفِ جگر سے سر کا اٹھانا ہوا محال
کم طاقتی سے قوتِ دل کا ہوا زوال
چین اس پہ بھی نہ لیتی تھی افواجِ بدخصال
ارماں نکل گئے سپہ بد شعار کے
زیں سے گرایا خاک پہ نیزوں کو مار کے

(۱۷۴)

یاں تو حسن کا حالتِ غش میں گرا پسر
واں ان کی ماں کے دل کو ہوئی خود بخود خبر
یہ کہتی آئی تا درِ خیمہ وہ نوحہ گر
بیٹھے ہوئے کدھر ہیں شہنشاہِ بحر و بر
آقا کمائی آپ کے بھائی کی لٹ گئی
ماں اپنے ایک رات کے بیاہے سے چھٹ گئی

(۱۷۵)

بڑھ کر ملاحظہ ہو پُر ارماں کا حالِ زار
بے وجہ دل نہیں مرا سینے میں بے قرار
منہ تک کلیجہ آتا ہے اس وقت بار بار
تھمتا نہیں ہے آنکھ سے اب آنسوؤں کا تار
ہر سو دکھائی دیتا ہے تاریک گھر مجھے
دیتا ہے قلبِ زار برابر خبر مجھے

(۱۷۶)

تھا یہ بیاں جو آئی یہ عباسؑ کی صدا
مقتل میں جلدی آئیے اے شاہِ کربلا
گھوڑے سے رن میں گر پڑا اک رات کا بنا
یہ سنتے ہی تڑپ گئے سلطانِ نینوا
غم یوں ہوا کہ زیست کا نقشہ بگڑ گیا
اک اور داغِ شہ کے کلیجے پہ پڑ گیا

(۱۷۷)

اُٹھے زمیں سے خسرو دیں بھر کے ایک آہ
تھاما پسر کا ہاتھ ہوئے ایسے کم نگاہ
طے بسملوں کی طرح سے کی شہ نے اتنی راہ
دولہا کو تھی چھپائے ہوئے جس طرف سپاہ
مطلب یہ رن میں تھا سپہ کینہ خواہ کا
لاشہ نہ دو حسینؑ کو شبرؑ کے ماہ کا

(۱۷۸)

دل پر غمِ جدائی اُٹھایا کریں حسینؑ
ہر سمت ڈھونڈتے ہوئے جایا کریں حسینؑ
آرام ایک دم بھی نہ پایا کریں حسینؑ
خواہش یہ تھی کہ ٹھوکرین کھایا کریں حسینؑ
لطفِ جفا نہیں جو جگر شہ کا خوں نہ ہو
مطلب یہ تھا دکھ ہوئے دل کو سکوں نہ ہو

(۱۷۹)

یاں لب پہ یہ بیاں تھا کہ اے ساکنانِ شام
اب کیوں جفا ہے گر چکا زیں سے وہ لالہ فام
جی بھر کے خوب لے چکے ازرق کا انتقام
لڑتے تھے جس سے اس کی ہوئی زندگی تمام
حسرت یہ ہے کہ پہنچوں تنِ پاش پاش تک
آنے دو مجھ غریب کو دولہا کی لاش تک

(۱۸۰)

میت پہ اپنے لال کی آؤں جو تم کہو
اس غم میں لب تک آہ کو لاؤں جو تم کہو
دولہا کو لے کے دشت سے جاؤں جو تم کہو
حسرت بھرے کی لاش اُٹھاؤں جو تم کہو
ہم دور ہوں، جہاں سے وہ منہ موڑتا رہے
کب تک زمینِ گرم پہ دم توڑتا رہے

(۱۸۱)

اس کہنے پر بھی جب نہ ہٹا لشکرِ وفا
تلوار لے کے جا پڑے عباسؑ با وفا
اک وار ہی میں غیظ سے محشر ہوا بپا
گھوڑے بڑھا کے بھاگے سوارانِ پُر جفا
اس تہلکے سے دشت میں یہ حال ہو گیا
دولہا سموں سے گھوڑوں کے پامال ہو گیا

(۱۸۲)

پسپا ہوئی جو فوج تو دیکھا یہ حال زار
جلتی زمیں پہ ہچکیاں لیتے ہیں بار بار
نکلڑے ہے جسم ماتھے کا سہرا ہے تار تار
ہے اشک خوں سے رن میں ہر اک پھول اشکبار
پڑمردہ لب کی طرح ہے پھولوں کا ہار بھی
ان کی طرح تمام ہے گل کی بہار بھی

(۱۸۳)

آہستہ ضعف دل سے یہ کہتا ہے وہ قمر
دوں کس طرح صدا کہ لہو ہیں دل و جگر
نا طاقی سے دہر میں مجبور ہے بشر
دے کون امام دیں کو مرے قتل کی خبر
دوری کا رنج، قلب مسافر کا سہ نہ جائے
آنکھیں قدم پہ ملنے کا ارمان رہ نہ جائے

(۱۸۴)

کہتے ہیں موت سے یہ کبھی ہو کے بے قرار
دم بھر ٹھہر کہ ہے شہ والا کا انتظار
دے کوچ کی خبر نہ ابھی کربِ احتضار
جب تک نہ آلیں پاس مرے شاہِ نامدار
گر ہجر ہی رہا تو نہ کم ہوگا غم مرا
مشکل سے خاک گرم پہ نکلے گا دم مرا

(۱۸۵)

کانوں تک آئی سروں دیں کی جو یہ صدا
میت گلے لگا کے یہ شبیر نے کہا
کیا کہہ رہے ہو غش میں، چچا تم پہ ہو فدا
کھولو تو آنکھیں قلب کا بر آیا مدعا
گھر میرا اُجڑا، موت کا اے لال کیا گیا
بالیں پہ جس کو ڈھونڈ رہے تھے وہ آ گیا

(۱۸۶)

پایا زمین گرم پہ اے مہ لقا تمہیں
رن میں نہ جلدی آنے کا ہوگا گلہ تمہیں
کیوں کربِ احتضار کا غم تھا سوا تمہیں
ہم جب تلک نہ آتے نہ آتی قضا تمہیں
لب تک مرا جگر دمِ فریاد آ گیا
لو اب تو خوش ہوئے کہ یہ ناشاد آ گیا

(۱۸۷)

تم مضطرب جو ہو تو سوا ہے مرا بھی غم
دل پر مفارقت کا نہ بس اب کرو الم
چہرے پہ ڈھل کے آئیں ہیں کیوں اشکِ چشمِ غم
آغوش میں چچا کے بصد شوق توڑو دم
تڑپاتے جاؤ قلب، قریب سفر مرا
لو ہچکیاں تم، آئے لبوں تک جگر مرا

(۱۸۸)

ہشیار اس بیاں سے ہوا کچھ وہ لالہ فام
حسرت سے آنکھیں کھول کے دیکھا رخِ امام
کچھ اس طرح خفیف صدا سے کیا کلام
بالیں پہ جس کو سمجھے بہ مشکل شہِ انام
مسرور طبع تا نفسِ چند ہو گئے
پھر چشمِ نیم بازِ جری بند ہو گئے

(۱۸۹)

بے ہوش جب ہوئے تھے تو تھی لب پہ یہ صدا
اک آرزو میں رکھتا ہوں اے شاہِ کربلا
خیمہ میں لاش لے کے جو جائیں شہِ ہدا
پہلے سے ڈال دیجیئے گا جسم پر ردا
آگاہ اس سے دشت میں شاہِ غیور ہیں
ٹاپوں سے میرے عضوِ بدن چور ہیں

(۱۹۰)

اس کیفیت کا قلب پہ ظاہر اثر نہ ہو
آگاہ اس سے گھر میں کوئی نوحہ گر نہ ہو
ظاہر یہ حال اے شہِ جن و بشر نہ ہو
اماں کو پائمالی تن کی خبر نہ ہو
خونِ جسم کا ملال و مصیبت سے گھٹ نہ جائے
دل ان کا میرے زخم کی مانند پھٹ نہ جائے

(۱۹۱)

روئے یہ سن کے دشت میں شاہنہ زماں
تڑپے جگر کو تھام کے عباسؑ نوجواں
ضعف اس قدر بڑھا جو ہوا اور خوں رواں
ہجکی بھی ناتوانی دل سے ہوئی گراں
قلبِ امامؑ دیں ہمہ تن درد ہو گیا
نکلی جو روح سینے سے منہ زرد ہو گیا

(۱۹۲)

منہ رکھ کے منہ پہ کہنے لگے شاہؑ کربلا
بیٹا چچا نثار ہو، کیسا یہ غم دیا
ارمان میرے دیکھنے کا دل کو تھا بڑا
اب آرزو نکل گئی اے میرے منہ لقا
کیا جلد ظلم موت سے صورت بدل گئی
پاؤں پہ سر کے رکھنے کی حسرت نکل گئی

(۱۹۳)

اٹھو زمینِ گرم سے قاسمؑ! چچا نثار
تم بے خبر جو سوتے ہو ہے قلب بے قرار
رن سے ہمارے ساتھ چلو ہو کے ہوشیار
ہوگا تمہارا دیر سے بھابھی کو انتظار
مانع نہ ہوں گا دشت میں خیمہ سے جا کے آؤ
اچھا یہی خوشی ہے تو صورت دکھا کے آؤ

(۱۹۴)

جب حد کے بے قرار ہوئے شاہؑ دیں پناہ
عباسؑ نے یہ عرض کی سینے سے بھر کے آہ
اللہ چلے خیمہ میں اے شاہؑ عرش جاہ
سیدانیوں کا ہوئے گا حال اور بھی تباہ
خیمہ میں چلے لے کے تنِ پاش پاش کو
ماں نامراد دیکھ لے دولہا کی لاش کو

(۱۹۵)

رقت کو ضبط کر کے یہ بولے شر ہڈا
ہے چور چور تیغوں سے اک رات کا بنا
چادر میں رکھ کے لاش کے ٹکڑوں کو میں فدا
میت اٹھا کے لے چلو اے میرے منہ لقا
منہ آنسوؤں سے غم میں بھگوتے ہوئے چلیں
ہم پیچھے پیچھے لاش کے روتے ہوئے چلیں

(۱۹۶)

یہ سن کے روئے اکبرؑ و عباسؑ نامدار
رکھ کر ردا میں لاش ہوئے حد کے بے قرار
میت اٹھائی دشتِ ستم سے بحالِ زار
یوں رن سے گھر میں جاتا ہے شہرؑ کا یادگار
ارماں عجیب طرح سے دل کے نکالے ہیں
عباسؑ سر، کمر علی اکبرؑ سنبھالے ہیں

(۱۹۷)

یوں لاش لے کے آئے جو خیمہ میں شاہؑ دیں
در پر کھڑے تھے یاں حرم ختمِ مرسلینؑ
دیکھی یہ کیفیت تو ہر اک دل ہوا حزیں
سیدانیوں کے بین سے ہلنے لگی زمیں
مسند پہ لاش رکھ کے شرؑ دیں جو ہٹ گئے
دولہا کی ماں کے قلب و جگر غم سے پھٹ گئے

(۱۹۸)

چادر ہٹا کے پہلے تو دیکھا رخِ پسر
کہنے لگی یہ پیٹ کے سر پھر وہ نوحہ گر
ہے ہے تمہارے بیاہ پہ کس کی لگی نظر
شب کی دولہن کو چھوڑ کے وارے کیا سفر
تم نے تو طے جناں کی زمانے سے راہ کی
ماں صدقہ، کون شکل ہے اس کے نباہ کی

(۱۹۹)

چھوڑا بنی کو دشت میں اے مجتبیٰ کے جائے
 دولہا کو اپنے ڈھونڈھ کے ماں اب کہاں سے لائے
 دنیا سے اتنا جلد کیا کوچ ہائے ہائے
 سہرے کے پھول اچھی طرح سوکھنے نہ پائے
 نکبت میں گل کے آج اثر خوں کی بو کے ہیں
 بدھی کے پھول جسم میں قطرے لہو کے ہیں

(۲۰۰)

اے رائٹ ماں کے پوچھنے والے ترے نثار
 بند آنکھ تو کئے ہے، تو ہے قلب بے قرار
 اللہ کتنا ہے مری جاں نیند کا خمار
 ہوتے نہیں ہو میرے جگانے سے ہوشیار
 گر چپ رہو گے تم تو بڑھے گا الم مرا
 لو منہ سے کچھ کہو کہ اُلجھتا ہے دم مرا

(۲۰۱)

بتلاؤ ماں کو تم نے کدھر کا کیا سفر
 آنکھیں لہو میں ڈوبی ہیں چہرہ ہے خوں سے تر
 گریز گراں سے ٹکڑے ہوا استخوانِ سر
 ہیں پاش پاش نوکِ سناں سے دل و جگر
 رن سے سواری یوں مرے بچے کی آئی ہے
 ماں کو عجیب حال سے صورت دکھائی ہے

(۲۰۲)

دیکھو تو آنکھیں کھول کے، ماں صدقے، اپنا حال
 بکھرے ہوئے ہیں چاند سے چہرے پہ سر کے بال
 کنگھی کرو تو جائے مرے قلب کا ملال
 مٹی مری خراب ہوئی اے حسن کے لال
 واری جو تم نہیں تو ہمارا کوئی نہیں
 دنیا میں رائٹ ماں کا سہارا کوئی نہیں

(۲۰۳)

میدیاں میں نام اپنے بزرگوں کا کر کے آئے
 سر کے لہو سے چاند سی صورت کو بھر کے آئے
 آئے بھی گھر میں تم تو جہاں سے گذر کے آئے
 قاسم میں کس طرح سے کہوں یہ کہ مر کے آئے
 مجھ سے مصر تھے رن کی اجازت کے واسطے
 گھر میں ابھی تو آئے تھے رخصت کے واسطے

(۲۰۴)

پھرتی ہے شکل چاند سی، آنکھوں میں، میں فدا
 دم بھر میں کیا سے کیا ہوا اے میرے مہ لقا
 سمجھی نہ وقتِ عقد یہ ماں غم کی بتلا
 سہرا بندھا ہے جس پہ اسی سر پہ ہے قضا
 اپنی کمائی صبح کو ہاتھوں سے کھوؤں گی
 میں یہ نہ جانتی تھی کہ دولہا کو روؤں گی

(۲۰۵)

پُر درد تھا یہ مادرِ نوشاہ کا بیاں
 اس حد پہ دل تپاں تھا کہ روتی تھیں پییاں
 دو سمت حشر خیمہ حضرت میں تھا عیاں
 اک ان کے قربِ لاش اور اک تھی دولہن جہاں
 ہر آہ غم فلک کا کلیجہ دکھاتی تھی
 آواز دونوں سمت سے رونے کی آتی تھی

(۲۰۶)

کچھ اس طرف تھیں جمع تو کچھ پییاں ادھر
 دولہا کی ماں تھیں لاش پہ قاسم کی نوحہ گر
 جگہ میں ماں دولہن کی ادھر پیٹی تھی سر
 چلا رہی تھی ہاتھ سے تھامے ہوئے جگر
 بیدار قسمتیں جو ہماری تھیں سو گئیں
 ماں صدقے اتنی عمر میں تم رائٹ ہو گئیں

(۲۰۷)

تمام شد مرثیه بتاریخ ۲۸ ماه محرم الحرام
روز شنبه ۱۳۲۳ هـ به ساعت یک و سه دقیقه باقی از
روزاز خطّ ناقص سید فرزند حسین عرف اچهن
صاحب ذاکر تمام گشت۔

(۲۰۷)

کیا سخت بختِ شوم نے بچے کو دن دکھائے
دولہا شہید ہو گیا کیوں غم نہ دل پہ کھائے
کچھ منہ سے بھی تو کہہ نہیں سکتی یہ ہائے ہائے
دل یر جو گزری تاہ زماں کس طرح سے لائے

روئیں یہ کہہ کے بانوئے شاہنشاہِ ہدا
ساتھ ان کے بیسیوں میں قیامت ہوئی پیا
دل پر غم و ملال سے قابو نہ جب رہا
بے ہوش ہو کے گر پڑی وہ غم کی مبتلا
تڑپاتی تھی جگر دلِ ناشاد کی صدا
باہر امامؑ تک گئی فریاد کی صدا
(۲۰۹)

ذٰخِرٌ بَسْ اَبِیَّانَ نہ کر حالِ رنج و غم
اہلِ عزا تڑپتے ہیں بس روک لے قلم
درگاہِ حق میں عرض یہ کر رو کے دم بدم
یا رب بحق سرور و سلطانِ ذی حشم
نعمت یہ اپنی سر سے مرے کم نہ کیجیو
صحت جنابِ قبلہ و کعبہ کو دیجیو

مسدس در حال حضرت سید سجادؑ

عالیجناب سید بختیار حسین صاحب جوہر بہرائچی، ابن سید اولاد حسین تعلقدار، بانی امام باڑہ قلعہ، بہرائچ

منزل وہی، وفاؤں کی راہیں الگ الگ
جیسے ہو نور ایک، نگاہیں الگ الگ

(۵)

بچوں کی اعطش تو کبھی بیبیوں کے بین
آنکھوں میں اشک اور زبانوں پہ یا حسینؑ
سنتا رہا سکون سے کنبہ کا شور و شین
ہوتی ہے اس طرح سے بھی تسخیر مشرقین

دُروں سے ہائے جسم منور فگار تھا
لیکن زباں پہ شکرِ خدا بار بار تھا

(۶)

وہ بیڑیاں، وہ طوق گراں بار، الاماں
وہ اک ضعیف و بیکس و ناچار، الاماں
ماں بہنیں سر کھلے سر بازار، الاماں
نیزے پہ فرق سید ابرار، الاماں

اے دو جہاں کے مالک و مختار الغیاث
یہ ظلم اور عابد بیمار الغیاث

(۷)

ہے قصر ظلم و جور کی تعمیر آج کل
ترکش میں ظالموں کے ہیں پھر تیر آج کل
پھر ہے وسیع حلقہ زنجیر آج کل
جینے کی اب نہیں کوئی تدبیر آج کل

ہے بحر زندگی میں تلاطم مدد کرو
جوہر کی اے امام چہارم مدد کرو



(ماخوذ از سفر از لکھنؤ محرم نمبر ۲۷۳۱ھ مطابق ۱۷ ستمبر ۱۹۵۲ء ص ۴۲)

(۱)

رنج و غم و الم کے خریدار السلام
اے بیکسوں کے قافلہ سالار السلام
بعد حسینؑ دیں کے مددگار السلام
ہاں السلام عابد بیمار السلام
عقبی ترے ثار یہ دنیا ترے ثار
ہو حاصل نماز جو سجدہ ترے ثار

(۲)

فخر حسینؑ فخر دو عالم ترے ثار
رنج و الم ثار تو، ہر غم ترے ثار
عالم نہ کیوں ہو نور مجسم ترے ثار
جب ہو گیا حسینؑ کا ماتم ترے ثار
شام الم کو صبح درخشاں بنا دیا
راہ وفا میں کانٹوں پہ چلنا سکھا دیا

(۳)

خلق حسنؑ کا آپ نے خاکہ دکھا دیا
عزم حسینؑ کا کبھی جلوہ دکھا دیا
صبر و رضا کا گاہ نمونہ دکھا دیا
سجادؑ نے حیات کا نقشہ دکھا دیا

مقصد یہ تھا نہ قید میں جانے سے عار ہو
اے اُمتِ رسولؐ فقط حق سے پیار ہو

(۴)

جنگ حسینؑ اور تھی عابد کی جنگ اور
اُن کی امنگ اور تھی اِن کی امنگ اور
وہ مے تھی اور، اور یہ مئے لالہ رنگ اور
باطل کو تھے جہاں سے مٹانے کے ڈھنگ اور

خانوادہ اجتہاد کی ایک بزرگ خاتون محترمہ مرضیہ شمش زائرہ کی رحلت

۳۱ اگست ۲۰۱۰ء مطابق ۱۰ ذیقعدہ ۱۴۳۸ھ (جمعرات) کی صبح ذکر شام غریباں عمدۃ العلماء آیت اللہ سید کلب حسین نقوی اختر کی دختر کی نیک اختر اور علمبردار اتحاد بین المسلمین صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد نقوی رحمت مآب وڈاکٹر مولانا سید کلب صادق صاحب کی بہن، جناب شمس الحسن تاج صاحب کی اہلیہ اور شکیل حسن شمش صاحب کی والدہ ماجدہ نیز قائد ملت مولانا سید کلب جواد نقوی صاحب کی پھوپھی محترمہ مرضیہ شمش زائرہ نے اس دار فانی سے دار بقا کی جانب رحلت فرمائی۔ مرحومہ تقریباً ۸۲ سال کی تھیں اور ادھر چند دنوں سے علیل تھیں۔ مرحومہ کو علم و ادب سے خاص شغف تھا۔ انہوں نے خانوادہ اجتہاد کی نوحہ نگار شاعرات کے تذکرے اور ان کے نمونہ کلام پر مشتمل ایک کتاب بھی تاثیر عزاکے نام سے تالیف فرمائی ہے جو نور ہدایت فاؤنڈیشن لکھنؤ سے جنوری ۲۰۱۱ء میں شائع بھی ہو چکی ہے اس کے علاوہ مرحومہ کے نوحوں اور سلاموں کے دو مجموعے (۱) کلام زائرہ (۲) فغان زائرہ بھی ہیں جو ادارے ہی سے شائع ہوئے ہیں۔ مرحومہ کی تدفین اسی روز بعد نماز مغربین حسینہ حضرت غفران مآب لکھنؤ میں ہوئی۔ نماز جنازہ قائد ملت مولانا سید کلب جواد نقوی صاحب کی اقتدا میں ہوئی۔ مرحومہ کی مجلس سوم ۶ اگست ۲۰۱۰ء مطابق ۱۳ ذیقعدہ ۱۴۳۸ھ (اتوار) کو امام باڑہ غفران مآب میں منعقد ہوئی۔ ادارہ قارئین سے ملتسم ہے کہ ایک بار سورہ فاتحہ اور تین بار سورہ توحید کی تلاوت فرما کر مرحومہ کو ایصال فرمائیں۔

ایران کی حمایت سے ہمیں دہشت گرد تنظیموں پر فتح حاصل ہوئی: سید حسن نصر اللہ

اہل بیت نیوز ایجنسی ابنہا کے مطابق حزب اللہ لبنان کے سربراہ جت الاسلام سید حسن نصر اللہ کا کہنا ہے کہ ساری دنیا جان لے کہ ہمیں دہشت گرد تنظیموں پر جس وجہ سے فتح حاصل ہوئی وہ ایران کی حمایت تھی۔ حزب اللہ لبنان کے سیکرٹری جنرل سید حسن نصر اللہ نے فتح عرسال کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے کہا تھا کہ لبنان سے النصرہ کا صفایا کرنے کے بعد خطاب کروں گا۔ سب سے پہلے میں آزاد ہو کر وطن لوٹنے والوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ شہداء کے اہل خانہ کو بھی تبریک اور تسلیت پیش کرتا ہوں۔

انہوں نے کہا کہ ابھی ہمارے کچھ شہداء کی لاشیں داعش کے قبضے میں ہیں اور کچھ افراد ناپید ہیں جن کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ شہید ہو گئے یا اسیر بنائے گئے ہیں۔ ان کے لئے میں ذاتی طور پر کوششوں میں مصروف ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اس جنگ میں شامی افواج نے نہایت اہم کردار نبھایا ہے لیکن افسوس میڈیا نے شامی افواج کو وہ توجہ نہیں دی جس کے وہ حقدار تھے۔ ہمارا اخلاقی فریضہ ہے کہ بشار الاسد اور ان کے عسکری حکام کا شکریہ ادا کریں۔

انہوں نے کہا کہ ہم نے عرسال اور فلیطہ میں ایرانی اسلحوں اور ایران کے تجربات کی بنا پر جنگ لڑی۔ ساری دنیا جان لے کہ ہم نے دہشت گرد تنظیموں پر ایران کی بھرپور حمایت کے سبب فتح حاصل کی۔

انہوں نے کہا کہ شام اور لبنان کے کچھ علاقوں پر اب بھی دہشت گرد تنظیم داعش کا قبضہ ہے جس کا علاقہ 296 کلومیٹر کے قریب ہے اور اس علاقے کو آزاد کرانے کے لئے لبنانی فوج کو اقدام کرنا ہوگا۔



نریندر مودی
وزیر اعظم

71 واں یوم آزادی



ہندوستان کے یوم آزادی کے موقع پر
ریاست کے سبھی باشندگان کو دلی مبارکباد



آزادی کی لڑائی اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے

شہید ہوئے بھی معلوم۔ نامعلوم مجاہدین اور مجاہدین کو صد ہا سلام

یشمو کی وزیراعظم چناؤ پر نیندر مودی جی نے ایک اہم عہد کیا ہے۔

اس کے تحت سال 2017 سے سال 2022 تک ”استحباب سے سدھی“ تم چائی جائے گی۔

عزت آج وزیراعظم جی کی مشاء کے مطابق ہم سب نے مل کر جمہور کیا ہے۔

سال 2022 تک نئے ہندوستان کی تعمیر کا

یہ نیا بھارت ایک بہتر اور صاف بھارت ہوگا

یہ جدید بھارت غریبی، بد عنوانی، دہشت گردی، ذات پرستی اور

فرقہ واریت سے پاک ہوگا۔

حکومت انٹر دیش نے تبدیلی، ترقی اور انٹیو دیہ

کے لئے نئے دور کی شروعات کی ہے۔

یوگی آدتیہ ناتھ

وزیراعلیٰ، انٹر دیش

محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، انٹر دیشی

سب کا ساتھ - سب کا وکاس

